جان پہچان





نظیر صدیقی



اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی

(شخصی خاکوں کا مجموعہ)

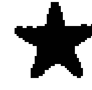
جان پہچان

از

نظیر صدیقی



اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی





● پہلی بار

● سالِ اشاعت : ۱۹۷۹

● مطبوعہ: باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی



بھائی منظور احمد کے نام

جن کا قلم ہمیشہ مظلوموں
کا ترجمان رہا ہے

ترتیب

ازراہِ تمہید

'جان پہچان' میرے ان خاکوں کا مجموعہ ہے جن کے موضوعات کچھ مشہور و ممتاز ادبی شخصیتیں ہیں، کچھ جواں مرگ ادبی صلاحیتیں اور ایک طالب علم جو امتحان کے دوران طلبہ اور پولیس کے تصادم میں ناجائز طور پر پولیس کی گولی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خاکے کی بجائے نثری مرثیہ ہے۔ اسی طرح سوز حیدرآبادی سے متعلق خاکہ بھی ان کی خودکشی کے بعد ان پر ایک تعزیتی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان خاکوں کے موضوعات سے میرے تعلقات نیازمندانہ بھی رہے ہیں اور دوستانہ بھی۔ تاہم اس مجموعے کے نام کے لیے مجموعی طور پر مجھے 'جان پہچان' کا لفظ زیادہ پسند آیا۔

ان خاکوں میں سے بعض متعلقہ شخصیتوں کی زندگی میں لکھے گئے تھے لیکن اب جب کہ یہ کتاب مرتب کی گئی ہے دیکھتا ہوں کہ ان خاکوں کے بیشتر موضوعات مرحومین کی صف میں جا پہنچے ہیں۔ زندہ شخصیتوں میں صرف اے کے بروہی اور جوش ملیح آبادی کے خاکے ہیں سو جوش بھی اپنے آپ کو جوش مرحوم لکھا کرتے ہیں۔

خاکہ ان ادبی اصناف میں سے ہے جنھیں پڑھنے سے مجھے گہری دلچسپی

رہی ہے لیکن خاکہ نگاری میری زندگی کے ادبی پروگرام میں شامل نہیں۔ یہ خاکے میری ضمنی ادبی سرگرمیوں میں سے ہیں اور انھیں لکھتے وقت میرا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ متعلقہ شخصیتوں کے جو پہلو میرے مشاہدے اور علم میں آئے ہیں انھیں محفوظ کر دیا جائے یعنی کسی شخصیت کا مکمل مطالعہ پیش کرنا میرا مقصد نہیں رہا ہے۔ میرا خیال یا میری خام خیالی یہ رہی ہے کہ ادب میں اس طرح کی ادھوری کوششیں بھی افادیت سے خالی نہیں ہوتیں۔

نظیر صدیقی

۱۵ فروری ۱۹۷۹ء

شعبۂ اردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

اسلام آباد

وحشت کلکتوی

اُردو ادب پر عجب وقت آپڑا ہے ۔ ابھی ہم ایک ادیب یا شاعر کے ماتم سے فارغ بھی نہیں ہو پاتے کہ دوسرے کے مرنے کی خبر آجاتی ہے ۔ مجاز ، قاضی عبدالغفار ، بیخود دہلوی اور پنڈت کیفی کی دائمی جدائی میں ہماری آنکھیں اشکبار اور ہمارے دل سوگوار تھے ہی کہ وحشت صاحب بھی داغِ مفارقت دے گئے ۔ وہ " اگلے لوگوں " میں سے تھے اور " اگلے لوگوں " میں جا ملے ۔ ان کی وفات نے ہم سے نہ صرف ایک کامل الفن شاعر کو چھین لیا بلکہ ایک عظیم انسان کو بھی ۔ وحشت صاحب ایک عظیم انسان تھے ۔ سماجی اور سیاسی نقطۂ نظر سے نہیں ۔ اخلاقی وتہذیبی نقطۂ نظر سے ۔ اس بات کو وہ سب لوگ جانتے اور مانتے ہیں جنہیں ان سے دو چار مرتبہ بھی ملنے کا شرف حاصل رہا ہے ۔

جن لوگوں نے وحشت صاحب کو کتابوں اور رسالوں میں دیکھا ہے وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ 'شخص' کے اعتبار سے وحشت صاحب کیا تھے اور کیسے تھے ۔ انہیں ذاتی طور پر جاننے والوں کی زبان اور زبانِ قلم دونوں پر آج اِس قسم کے فقرے رواں ہیں کہ ' ایک عظیم انسان دنیا سے اُٹھ گیا ' ، ' مَیں نے اپنی زندگی میں ان سے بہتر مخلص انسان اب تک کسی کو نہیں دیکھا ' ، ' اخلاق اور شرافت کا ایسا مجسمہ میری نظر سے نہیں گزرا ' ، ' وہ فرشتوں کے درمیان آدمی سمجھے جائیں گے ۔ لیکن آدمیوں کے درمیان فرشتہ تھے ' ، ' وہ آدمی نہیں ، ولی تھے ' یہ اور اسی قبیل کے بہت سے فقرے زبانوں سے نکل کر کانوں سے ٹکرا رہے ہیں ۔

لیکن سچ پوچھئے تو وحشت صاحب نہ ولی تھے نہ فرشتہ ۔ وہ محض انسان تھے ۔ اُس قسم کے انسان جن کے بارے ہی حالی نے کہا ہے کہ :

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

وحشت صاحب جن خوبیوں کے انسان تھے ان خوبیوں کا انسان بننے میں انہیں کتنی مشقت اور کتنی ریاضت سے کام لینا پڑا اس کا حال ان کے سوا کسی اور کو کیا معلوم، لیکن انہیں دیکھ کر اور ان سے مل کر محسوس یہی ہوتا تھا کہ ایک انسان کی حیثیت سے وہ جو کچھ اور جیسے کچھ ہیں اس میں ان کی کوششوں اور محنتوں کو کوئی دخل نہیں۔ جیسے ان کی خوبیاں ان کی زندگی کے بنیادی اصول نہیں بلکہ ان کی فطرت کے بنیادی تقاضے تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتے میں اور آخری چند سال ڈھاکے میں گزرے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ کلکتے سے لے کر ڈھاکے تک ان کے جاننے والوں نے انہیں زندگی کے مختلف دور اور مختلف حال میں دیکھا لیکن تمام دیکھنے والوں کو وہ ہمیشہ یکساں نظر آئے۔ یہ سرگوشی کہیں بھی سننے میں نہیں آتی کہ جوانی کے وحشت بڑھاپے کے وحشت سے یا کلکتے کے وحشت ڈھاکے کے وحشت سے مختلف تھے۔ ان کی شخصیت کا یہ کتنا بڑا احسن ہے کہ آج ان کی وفات کے بعد ان کی تعریف میں کچھ کہتے یا لکھتے وقت کسی کو نہ تو اپنے ضمیر کے خلاف کچھ کہنا پڑ رہا ہے اور نہ اس اصول پر کاربند ہونے کی ضرورت پیش آ رہی ہے کہ مردوں کو اچھے ناموں سے یاد کرو۔ آج اگر ہم وحشت صاحب کی اچھائیوں کا گن گا رہے ہیں تو صرف اس لئے کہ ہم اس کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وحشت صاحب میں کوئی کمزوری تھی ہی نہیں۔ ہوگی۔ لیکن ہم ان کی کمزوریوں کے متعلق داغ کے الفاظ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ؎

سچ ہے بے عیب ہے خدا کی ذات
تجھ میں کیا جانیں کیا بُرائی ہے ؎

وحشت صاحب کے تمام اوصاف کو ایک لفظ میں جمع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے بلند اخلاق آدمی تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت کو بیان کرنے کے لئے ' بلند اخلاق ' سے زیادہ جامع لفظ شاید ہی کوئی اور ہو۔ مگر اس لفظ کی ساری جامعیت کے باوجود اس میں ان کی شخصیت کے سارے پہلو نہیں سما پاتے۔ بہرحال اس سے بڑھ کر ان کے اخلاق کی خوبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے تمام ملنے والوں کو ان کے اخلاق پر اخلاص کا گمان ہوتا تھا۔ وہ اخلاق خلا ہی کے لئے خلصانہ

اخلاق کے قائل تھے ۔ ان کے اخلاق کی انتہا یہ تھی کہ انہیں اپنے شاگرد کو شاگرد تک کہنے میں تامل ہوتا تھا مبادا اس سے اس کے وقار پر حرف آئے ۔ چنانچہ اگر ان سے کوئی پوچھتا کہ فلاں صاحب آپ کے شاگردوں میں سے ہیں تو جواب ملتا کہ ’ جی نہیں‘ وہ تو خود ہی بڑے خوش گو شاعر ہیں ۔ البتہ مجھ سے کبھی کبھار مشورہ کر لیا کرتے تھے ۔ اس باب میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ " مشرقی بنگال میں اُردو" کے مصنف پروفیسر اقبال عظیم نے لکھا ہے کہ " ایک مرتبہ اکبر حیدری نے مولانا کے پاس ایک نظم بغرض اصلاح بھیجی ۔ جب لفافہ مولانا کے ہاتھ میں پہنچا تو ان کے کچھ عزیز تلانذہ ان کی خدمت میں حاضر تھے ۔ لفافے کی رنگینی اور تکلف سے فطری طور پر انہیں تجسس پیدا ہوا کہ خط بھیجنے والے کا نام معلوم کریں ۔ سب نے الگ الگ اصرار کیا ۔ لیکن مولانا نے لفافہ جیب میں رکھ لیا اور ٹال گئے ۔ کچھ دنوں بعد کسی طرح حقیقت کھلی، لیکن مولانا کو نہ قبولنا تھا نہ قبولے ۔"

اخلاق کے تصور کے ساتھ کچھ تکلفات بھی وابستہ رہے ہیں ۔ عام طور پر کسی کے خلیق یا خوش اخلاق ہونے کی دلیل یہ سمجھی جاتی ہے کہ جب آپ اس کے یہاں جائیں تو وہ آپ کو چائے ضرور پلائے پان ضرور کھلائے اور سگریٹ ضرور پیش کرے ، اگر آپ کھانا کھانے کے وقت وارد یا نازل ہوئے ہوں تو گھر میں فاضل کھانا نہ ہونے کے باوجود وہ آپ سے اصرار کرے کہ کھانا کھا کر جائیے ۔ مَیں نے وحشت صاحب کو اس قسم کے تکلفات میں مبتلا ہوتے کبھی نہیں دیکھا ۔ مگر ان کے ایک عزیز شاگرد کا بیان ہے کہ جب تک وہ کلکتے میں رہے ایسا کبھی نہ ہُوا کہ کوئی ان سے ملنے گیا اور چائے پان کے بغیر واپس آیا ۔ لیکن ڈھاکے آنے کے بعد وحشت صاحب اپنے حالات کی بنا پر لوگوں کی خاطر مدارات سے معذور ہوگئے ۔ یہاں تو انہیں اتنا بھی میسر نہ تھا کہ اپنے مہمانوں کو اپنے کمرے میں بٹھا کر بات چیت کر سکیں ۔ جب کوئی ان سے ملنے جاتا تو اپنے فلیٹ کے باہر ملازم سے کرسیاں منگوا کر مہمان کو بٹھاتے اور خود بیٹھتے ۔

گزشتہ چھ سال کے اندر وحشت صاحب کی جسمانی قوت میں جو تدریجی انحطاط پیدا ہوا وہ میری آنکھ کے سامنے کا واقعہ ہے ۔ وہ فلیٹ جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری چھ سال گزارے تیسری منزل پر ہے ۔ یا تو وہ اس قابل تھے کہ پہلی منزل سے تیسری منزل تک کے تمام زینوں کو بغیر کسی

سہارے طے کر لیتے تھے یا پھر رفتہ رفتہ ایسے ہو گئے کہ دیوار کا سہارا لئے بغیر دروازے تک نہ آسکتے تھے۔ لیکن ضعیفی و ناتوانی کے اس عالم میں بھی جب تک وہ اپنے مہمان کو کرسی پر نہ بٹھا لیتے خود نہ بیٹھتے اگر کرسیاں کم ہوتیں تو جب تک ملازم کرسی لاکر نہ رکھتا، وہ ملاقاتیوں کے اصرار کے باوجود ان کے ساتھ کھڑے رہتے۔ بڑی بات یہ تھی کہ اس خستگی واضمحلال کے باوجود ان کے چہرے پر خوشی اور خوش دلی کی فضا نمایاں رہتی جو ملنے والوں کے لئے خیر مقدم کی حیثیت رکھتی تھی۔

وحشت صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ اس سے قبل جب وہ کشٹیا (مشرقی پاکستان) میں قیام پذیر تھے میرے ان کے درمیان ایک ادبی معاملے کے سلسلے میں خط وکتابت ہو چکی تھی۔ حلقۂ ارباب ذوق ڈھاکا کے جلسے میں جب ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو قمر صدیقی مرحوم جو ان کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے ان سے میرا تعارف کرانے لگے۔ میرا نام سنتے ہی وحشت صاحب نے کہا: انہیں تو میں جانتا ہوں۔ میں اس زمانہ میں بی۔ اے کا طالب علم اور دائرۂ ادب ڈھاکا کا سکریٹری تھا۔ ہر مہینے میں دائرے کی دو ایک نشستیں ضرور ہوا کرتی تھیں۔ لیکن ہم لوگ وحشت صاحب اور شادانی صاحب جیسے بزرگوں کو دائرے کی صرف غیر معمولی نشستوں میں مدعو کیا کرتے تھے۔ وحشت صاحب نے دائرے کی نشست میں شریک ہونے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ وہ بڑی خوشی سے ہماری دعوت قبول کرتے اور انتہائی پابندیِ وقت کے ساتھ جلسے میں تشریف لاتے۔ وحشت صاحب کی پابندیٔ وقت ان کے جاننے والوں کے درمیان ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس باب میں ان کا ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔ ایک مرتبہ وحشت صاحب مشاعرے میں شرکت کی غرض سے کلکتے سے ہاوڑے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے بعض تلامذہ اور احباب بھی جانے والے تھے جو پہلے سے ہاوڑا اسٹیشن پر موجود تھے۔ سوء اتفاق سے اس دن اسٹیشن پر وحشت صاحب کے پہنچنے میں دو ایک منٹ کی تاخیر ہو گئی۔ گاڑی وقت مقررہ پر چل پڑی۔ لیکن فوراً ہی کسی وجہ سے رک گئی۔ اتنے میں وحشت صاحب آ پہنچے۔ انہیں دیکھتے ہی کسی شاگرد یا دوست نے کہا۔ مولانا! گاڑی تو چل پڑی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف آپ کے لئے رک گئی۔ اس پر وحشت صاحب نے کہا: "میں نے زندگی بھر وقت کا لحاظ رکھا ہے۔ کیا وقت ایک دن بھی میرا لحاظ نہ رکھے گا؟"

چونکہ پاکستان جیسے نیم مہذب ملک میں لوگ وقت کی پابندی کو اپنا فرض نہیں سمجھتے اور نتیجتاً کوئی جلسہ وقت معینہ پر شروع نہیں ہوتا اس لئے جب ہم لوگ وحشت صاحب کو دائرے کے جلسوں میں مدعو کرتے تو ان سے یہ بھی کہہ دیتے کہ مولانا! جلسہ کا وقت تو پانچ بجے رکھا گیا ہے مگر آپ چھ بجے تشریف لائیے گا تاکہ آپ کو اور لوگوں کے آنے کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سجاد حیدر یلدرم کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ تمام آداب ان میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت کی جان و جواز ہیں۔ ان آداب کو وہ اس لطف اور آسانی سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے یا ایک حسین اپنے حُسن کا حامل ہوتا ہے"۔ یہاں یلدرم اور وحشت کا تقابل مقصود نہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ رشید صاحب کے یہ جملے وحشت صاحب پر بھی لفظ بہ لفظ صادق آتے ہیں۔ وحشت صاحب جب کسی مشاعرے کی صدارت کرتے تو چار زانو ہوکر بیٹھتے اور اسی وضع میں مشاعرے کی ساری رات اس طرح گزار دیتے جیسے بیٹھنے کی یہی وضع ان کے لئے سب سے زیادہ آرام دہ ہے۔

وحشت صاحب کی طبیعت میں متانت اور ظرافت دونوں کی دھوپ چھاؤں پائی جاتی تھی۔ ان کی شخصیت سنجیدگی اور شگفتگی کے دلکش امتزاج سے عبارت تھی۔ یہاں پھر مجھے رشید احمد صدیقی کے دو ایک ایسے جملے یاد آرہے ہیں جو انہوں نے لکھے تو ہیں سجاد حیدر یلدرم کے متعلق لیکن جو وحشت صاحب پر بھی حرف بہ حرف صادق آتے ہیں۔ رشید صاحب کے جملے یہ ہیں: "ان کی بے تکلفی میں دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی۔ وہ اسی حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقے کا اقتضا ہوتا تھا۔ اور بے تکلف بھی اسی حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسن معاشرت کا جزو اعظم سمجھی جاتی ہے"۔

ڈھاکے آنے کے بعد جب وحشت صاحب کی صحت کمزور سے کمزور تر ہونے لگی تو میں نے انہیں دائرے کی نشستوں میں مدعو کرنا ترک کر دیا اور جب میں نے یہ دیکھا کہ وحشت صاحب سے ان کے گھر پر بھی ملنا ان کے لئے زحمت سے خالی نہیں تو میری ان کی ملاقات کے وقفے طویل سے طویل تر ہوتے چلے گئے۔ اب مجھے ان سے کوئی بات دریافت کرنا ہوتی تو میں انہیں خط لکھ کر دریافت کر لیتا۔ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے ارباب قلم سے میری خط و کتابت

رہی ہے ۔ لیکن جواب کے معاملے میں جیسی مستعدی میں نے وحشت صاحب میں دیکھی ویسی اور کسی کے یہاں نظر نہ آئی ۔ اس باب میں ان کی مستعدی کا ذکر کرتے ہوئے اقبال عظیم نے یہاں تک لکھا ہے کہ " اگر ریڈیو کا کوئی خط آگیا جس کا جواب کسی خاص تاریخ کو جانا ہے تو جواب لفافے میں بند کر کے پہلے ہی سے رکھ دیا جائے گا اور اس کی پشت پر وہ تاریخ درج کر دی جائے گی جب اسے ڈاک کے حوالے کرنا ہے ۔"

معاصرانہ چشمک ادیبوں اور شاعروں کی عام کمزوری ہے ۔ وحشت صاحب کی ذات میں اِس کمزوری کا شائبہ تک نہ تھا ۔ وہ نہ تو خود کبھی اس مرض کا شکار ہوئے نہ انہوں نے اپنے اِرد گرد والوں کو اس مرض کا شکار ہونے دیا ۔ ان کا اخلاق اور ان کا انکسار اس مرض کے گرفتاروں کے لئے معالجے کا حکم رکھتا تھا ۔

وحشت صاحب حد درجہ منکسر المزاج ، صلح کل اور مرنجان مرنج قسم کے آدمی واقع ہوئے تھے ۔ وہ نہ دوسروں پر اعتراض کرتے تھے ، نہ اپنے آپ پر دوسروں کے اعتراض کا جواب دیتے تھے اور اگر کبھی جواب دیتے بھی تو اس انداز سے کہ معترض کو ناگوار نہ ہو ۔ ان کے ایک شاگرد نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ کسی نے ان کے ایک شعر پر اعتراض کیا ۔ وحشت صاحب کے شاگردوں میں سے کوئی صاحب اس اعتراض کو لے کر ان کے پاس گئے اور کہا کہ حضور ! اس شعر پر یہ اعتراض کیا گیا ہے ۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟ ۔ وحشت صاحب نے فرمایا کہ " چونکہ یہ اعتراض وحشت کے شعر پر ہے اس لئے صحیح ہے اگر کسی اور کے شعر پر یہ اعتراض ہوتا تو میں اس کی تردید میں فلاں کا یہ شعر پیش کرتا اور فلاں کا وہ شعر ۔ غرض کہ اسی وقت وحشت صاحب نے اعتراض کے جواب میں اساتذہ کے کلام سے دس بارہ شعر سند کے طور پر پیش کر دیئے ۔

وحشت صاحب محبت و مروت کا مجسمہ تھے ۔ وہ کوئی ایسا کام کرنے یا کوئی ایسی بات کہنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے جس سے کسی کی دل آزاری یا دل شکنی ہو ۔ انہیں دوسروں کا پاس خاطر اس حد تک عزیز تھا کہ وہ دوسروں کی " خوشی کی خاطر " سب کچھ گوارا کر لیتے اور بھگتنے کو تیار رہتے جب ان کا مجموعۂ کلام " ترانۂ وحشت " شائع ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ مولانا ! مجھے اس کتاب کا نام کچھ زیادہ پسند نہیں آیا ۔ کہنے لگے ۔ خود مجھے بھی یہ نام کچھ زیادہ پسند نہیں ۔ لیکن میں کیا کروں ۔

یہ نام فلاں صاحب نے انتخاب کیا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ یہی نام رکھا جائے۔ یہ بات سُن کر میں دم بخود رہ گیا۔ یہ کتنا بڑا ایثار تھا کہ جو چیز قیامت تک ان کے نام سے وابستہ رہے گی اس کا نام رکھنے میں انہوں نے کسی اور کی پسند کو اپنی پسند پر ترجیح دی۔

وحشت صاحب کی بعض خوبیاں ایسی ہی تھیں کہ ان کی تعریف ہر شخص کرے گا لیکن انہیں اپنانے کے لئے تیار کوئی بھی نہ ہوگا۔ معمولی سے معمولی رسالہ اور گھٹیا سے گھٹیا اخبار بھی ان سے غزل مانگ بھیجتا تو وہ اسے مایوس نہ کرتے۔ صرف اس لئے کہ کسی کو مایوس کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کی سیرت کے اس پہلو کی عظمت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ گھٹیا رسالوں اور اخباروں میں اپنے جگر پاروں کو دیکھ کر فن کار کے دل پر کیا گزرتی ہے۔

وحشت صاحب کبھی ان توقعات کو سمجھنے اور پورا کرنے سے پہلو تہی کرتے نہیں پائے گئے جو لفظوں میں ظاہر نہیں کی جاتیں بلکہ جو کسی خاص موقع محل کا تقاضا بن کر ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی عزیز یا دوست کی شادی یا کسی کامیابی کے موقع پر شاعر سے یہ توقع وابستہ ہوتی ہے کہ وہ اس تقریب میں سہرا یا مبارکباد کا قطعہ ضرور پڑھے گا۔ یہ توقع جس قدر عام ہے شاعر کے لئے اتنی ہی کوفت انگیز بھی ہے۔ بسا اوقات شعرا حضرات اپنے عزیز اور دوست کی فرمائش اور اصرار کے باوجود کچھ لکھ کر نہیں لاتے۔ لیکن میں نے وحشت صاحب کو ایسے موقعوں پر ایسے موقعوں کے تقاضوں کو اپنے دل سے پورا کرتے دیکھا۔ ان کے مجموعۂ کلام "ترانۂ وحشت" میں بھی ایسے اشعار اور قطعات کی تعداد خاصی ہے جو خاص تقریبات کے لئے کہے گئے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ "خیال خاطر احباب" ان کی شخصیت کا کتنا اہم جزو تھا۔

مرحوم کی سیرت کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں کے دُکھ درد میں اسی دل سوزی سے شریک ہوتے جو قریب ترین رشتہ داروں کا حصّہ ہوا کرتی ہے۔ ڈھاکے میں ان کے دو شاگرد پروفیسر عبدالقیوم حسرت نعمانی اور قمر صدیقی کا انتقال ہوا۔ اس زمانے میں وحشت صاحب سے میری ملاقات بہت کم ہوا کرتی تھی۔ لیکن میں نے بعض معتبر لوگوں سے سُنا کہ مولانا کی موجودگی میں جب کہیں اور جہاں کہیں حسرت نعمانی یا قمر صدیقی کا ذکر آ جاتا ہے وہ آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ مولانا پرانے لوگوں میں سے تھے پھر بھی ان کے مزاج میں مذہبیت کو کوئی خاص دخل نہ تھا۔ مَیں نے انہیں عام بوڑھے مسلمانوں کی طرح گفتگو میں اسلام کا قصیدہ یا مسلمانوں کا مرثیہ پڑھتے کبھی نہیں سُنا۔ ہندو مسلم تنازع یا تعلقات کے متعلق بھی کبھی کوئی فقرہ ان کی زبان سے سُننے میں نہیں آیا۔ جہاں تک میں اندازہ کرسکا ہوں وہ نماز کے بھی پابند نہ تھے۔ مگر انہیں آنحضرتؐ سے دلی شیفتگی ضرور تھی۔ چنانچہ وہ ہر سال ایک مرتبہ اپنے یہاں محفلِ میلاد منعقد کرتے جس میں میلاد کے رسمی خطبے کے بعد اپنی لکھی ہوئی نعتیہ غزلیں پڑھتے یا کسی سے پڑھواتے۔ محفلِ میلاد میں شرکت کے لئے وہ اپنے احباب اور تلامذہ کے نام دعوت نامے بھیجتے تھے۔ اس دعوت نامے کا مضمون ہمیشہ ایک ہی ہوتا۔ جب تک قویٰ نے ساتھ دیا وہ دعوت نامے اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجتے رہے۔ بعد میں چھپا ہوا دعوت نامہ بھیجنے لگے۔ جب مجھے پہلی مرتبہ محفلِ میلاد میں شرکت کا دعوت نامہ مِلا تو حیرت ہوئی کہ انہیں میرا پتا کیونکر معلوم ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خیال آیا کہ ان کے ڈھاکے آنے سے قبل میرے ان کے درمیان جو خط وکتابت ہوئی تھی اسی زمانے سے میرا پتا ان کے پاس محفوظ تھا۔ مولانا کی یہ بڑی خصوصیت تھی کہ وہ جس سے ایک بار مِل لیتے اسے کبھی نہ بھولتے اور جس کا پتا ایک مرتبہ دریافت یا درج کر لیتے اسے ہمیشہ محفوظ رکھتے۔

وحشت صاحب مشرقی تہذیب و تمدن کے آوردہ و پروردہ تھے۔ لیکن ان میں اصول پرستی اور انضباط پسندی (DISCIPLINE) اہلِ مغرب کی سی تھی۔ میرے ایک دوست جو کلکتے میں ان کے ہم محلّہ رہ چکے ہیں ان کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں وحشت صاحب اسلامیہ کالج کلکتہ میں اُردو کے پروفیسر تھے ان کا معمول یہ تھا کہ ہر روز کالج جانے کے لئے وہ اس ٹرام (TRAM) پر آجاتے جو ہمارے دوست کے مکان کے بالمقابل تھا۔ لیکن اگر ٹرام کے دروازے پر دو آدمی بھی کھڑے رہتے تو وہ اس پر سوار نہ ہوتے خواہ ٹرام کے اندر ایک سے زیادہ سیٹ کیوں نہ ہو۔ انہیں یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ وہ دروازے پر کھڑے رہنے والوں کو زحمت دے کر ٹرام میں داخل ہوں۔ چنانچہ انہیں ہر روز کئی ٹرام چھوڑ دینا پڑتی اور کافی دیر تک کھڑے رہنا پڑتا۔

اپنی تعریف اور دوسروں کی شکایت انسانی فطرت کی عام کمزوری ہے۔ لیکن میں نے وحشت صاحب کو اپنی تعریف اور دوسروں کی شکایت کرتے کبھی نہیں پایا۔ انہیں کسی سے اپنا دکھ درد تک بیان کرنے کی عادت نہ تھی۔ گزشتہ دو تین سال کے اندر جب کہ ان کی صحت بہت مضمحل ہو چکی میں جب کبھی ملا اور ملتے وقت میں نے پوچھا کہ مولانا! مزاج کیسا ہے تو انہوں نے ایک حزیں تبسم کے ساتھ یہ کہہ کر کہ اب مزاج کیا پوچھتے ہیں موضوع گفتگو بدل ڈالا۔ ان کی زندگی کا آخری سال بہت سخت گزرا۔ ذیابیطس کے پرانے مریض تھے۔ مرض کے شدائد اور قوی کے بڑھتے ہوئے اضمحلال نے انہیں نہ صرف چلنے پھرنے سے معذور کر دیا تھا بلکہ صاحبِ فراش بنا کر رکھ دیا تھا۔ ایک سال تک بستر پر پڑے پڑے شانے چھل گئے۔ اس دوران میں ایک مرتبہ وہ میڈیکل کالج ڈھاکا میں بھی داخل کئے گئے۔ لیکن مالی دقتوں کی بنا پر وہاں دو تین ہفتے سے زیادہ نہ رہ سکے۔ یہ بڑی اذیت ناک بات ہے کہ ان کے خاندان، ان کے احباب اور ان کے تلامذہ میں صاحبِ استطاعت لوگ موجود۔ لیکن کوئی ان کے کام نہ آیا۔ انہوں نے کسی سے اس بات کی شکایت تک نہیں کی۔ یہ ان کا ظرف تھا۔

گزشتہ ایک سال کے دوران میں میں ان کی خدمت میں صرف دو مرتبہ حاضر ہوا۔ اس کے قبل ان کے بعض احباب اور تلامذہ سے سن چکا تھا کہ اب کوئی ان سے ملنے جاتا ہے تو بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ میں ایسے مناظر سے ہمیشہ دُور رہنے کی کوشش کرتا ہوں کیونکہ ایسے مواقع پر میری زبان گنگ ہو جاتی ہے اور الفاظ میرا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے مواقع پر مریض و مصیبت زدہ کی تسکین و تسلی کے لئے جو کچھ کہا جاتا ہے اس کی حیثیت میرے نزدیک "مہذب جھوٹ" سے زیادہ نہیں اور مجھ میں "مہذب جھوٹ" بولنے کی صلاحیت بالکل نہیں۔ اس بنا پر میرا دل چاہا کہ اب وحشت صاحب سے نہ ملوں تو بہتر۔ لیکن پھر خیال آیا کہ میں وحشت صاحب کے مقربین میں سے نہیں۔ لہٰذا مجھے دیکھ کر وہ ہرگز آبدیدہ نہ ہوں گے۔ چنانچہ ایک دن شام کو میں ان کے یہاں جا پہنچا۔ پردہ کرا کے ان کے کمرہ میں گیا۔ میں نے سلام کیا تو جواب میں صرف ان کے لب ہلتے ہوئے

محسوس ہوئے ۔ اس کے بعد وہ چادر سے اپنا ایک ہاتھ نکالنے کی کوشش کرنے لگے جیسے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھانا چاہتے ہیں ۔ میں ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پلنگ سے لگی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا ۔ اس دن مولانا کے ضعف کا یہ عالم تھا کہ اس قدر قریب بیٹھنے کے باوجود ان کی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی ۔ جب میں نے پوچھا کہ مولانا اس وقت آپ کے جسم میں کوئی خاص تکلیف تو نہیں ، تو جواب میں یہ کہہ کر کہ کون سی تکلیف ہے جو میں برداشت نہیں کر رہا ہوں ، آبدیدہ ہوگئے ۔ میں دل میں سخت نادم ہُوا کہ ان سے کتنا احمقانہ سوال کرگیا ۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مولانا سے کیا بات کروں ۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کو خاموش دیکھتے رہے ۔ اب یاد نہیں کہ میں کن الفاظ کے ساتھ ان سے رخصت ہُوا ۔

مولانا کے ایک صاحبزادے علی امام ہمارے کالج میں انگریزی کے پروفیسر ہیں ۔ دوسرے یا تیسرے دن ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ابا تمہاری بڑی تعریف کر رہے تھے کہ میری عیادت کے لئے آئے ۔ میں یہ تعریف سُن کر نہایت شرمندہ ہوا کہ میں نے عیادت میں اتنی تاخیر کی ۔ مجھے اور پہلے جانا چاہیئے تھا اور کئی بار جانا چاہیئے تھا اور ایسا سوال ہرگز نہ کرنا چاہیئے تھا جو ان کے آنسوؤں کا محرک ہو ۔ تعجب ہے کہ مولانا میری اتنی کوتاہیوں کے باوجود میرے اخلاق کے مداح ہیں ۔ دراصل یہ ان کی بلند اخلاقی نہیں ہوبس ۔

اس واقعہ کے دو ایک مہینے کے بعد بعض احباب کے ساتھ میں پھر ان کی عیادت کو گیا ۔ اس مرتبہ ضعف نسبتاً کچھ کم تھا ۔ آواز قدرے صاف سُنائی دیتی تھی ۔ ہم لوگ ان کی تکلیف کے خیال سے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرے ۔ اب کی عید کے دوسرے تیسرے دن میں ان کے محلے کے ایک شخص سے ملنے گیا ۔ واپسی میں جی چاہا کہ پھر ایک مرتبہ مولانا سے مِل لوں ۔ چنانچہ ان کے فلیٹ پر چلا گیا ۔ لیکن دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے خیال آیا کہ ان سے ملنا ایک اذیت ناک صورتِ حال کا سامنا کرنے کے برابر ہے ۔ لہٰذا آج رہنے دو ۔ پھر کسی دن سہی ۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ دن آئے یہ خبر آئی کہ مولانا وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا کرتا ۔

مولانا سے عقیدت اور محبت رکھنے والوں کے لئے ان کی تدفین کا منظر بھی کچھ

کم دِل خراش نہ تھا۔ برسات کے موسم میں عظیم پورہ قبرستان کا ایک تہائی حصّہ غرقاب ہو جاتا ہے اور ساری زمین اس درجہ نم ہو جاتی ہے کہ ایک دو ہاتھ کھودنے پر پانی نکل آتا ہے۔ چنانچہ مولانا کی قبر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اگرچہ ان کے جنازے کو پانی میں رکھنے کی بجائے کیلے کے تنوں پر رکھا گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ قبر بند کی جائے کیلے کے تنے اور جنازے کا نچلا دھڑ پانی میں ڈوب چکا تھا۔ رُوح کے پرواز کر جانے کے بعد خالی خولی جسم کی کیا قیمت۔ پھر بھی اس صورتِ حال کو دیکھ کر دل کو سخت چوٹ لگی اور کئی دنوں تک یہ اذیت ناک منظر میرے ذہن پر طاری رہا۔

وحشتؔ صاحب کی وفات سے دو ایک مہینے قبل ان کے ایک شاگرد عابدؔ دانا پوری جو حکومت مشرقی پاکستانؔ میں ایک معمولی عہدے پر ملازم ہیں انہوں نے وحشتؔ صاحب کے نام سرکاری وظیفہ جاری کرانے کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کی۔ ان کی مسلسل کوششوں کی بدولت حکومت مشرقی پاکستان وحشتؔ صاحب کو وظیفہ دینے پر آمادہ ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی وظیفے کے اجرا کا مسئلہ دفتری کاروائی کی آخری منزل سے گزر رہا تھا کہ خود وحشتؔ صاحب کی زندگی کی آخری منزل آگئی۔ مرحوم کے جنازے میں جو لوگ شریک تھے ان میں سے بعض جذبات کی رو میں آکر یہ شکایت کر رہے تھے کہ ہماری حکومت ادیبوں اور شاعروں کے حقوق سے کس درجہ غافل واقع ہوئی ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ حکومت کو ادیبوں اور شاعروں کے حقوق سے غافل کی بجائے ناواقف کہنا بہتر ہوگا
آج جو لوگ اور جس قسم کے لوگ برسرِ اقتدار ہیں وہ شعر و ادب کی قدر و قیمت کیا جانیں۔ ابھی تو ہماری قوم اور ہمارے اربابِ حکومت کو مہذب قوموں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ شکر ہے کہ کرکٹ کی سرپرستی سے سیکھنے کی ابتدا ہو چکی ہے۔

آج ادیبوں اور شاعروں کی موت ہماری تہذیبی پستیوں کے احساس کا ذریعہ بن گئی ہے۔ جب کوئی ادیب یا شاعر مر جاتا ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمارا ادب اور آرٹ، ہمارے ادیب اور آرٹسٹ قوم اور حکومت کی کتنی بے التفاتیوں کے شکار رہے ہیں۔

ان بے التفاتیوں کے پیشِ نظر ہم برہم بھی ہوتے ہیں اور بیزار بھی۔ غمگین بھی اور غضب ناک بھی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں دس فی صد لوگ نام نہاد تعلیم یافتہ ہوں اور نوے فی صد جاہل محض اور جن کے جاہل محض رہنے میں برسرِ اقتدار طبقے کا مفاد پوشیدہ ہو وہاں شعر و ادب کی سماجی قدر شناسی اور سرکاری سرپرستی کیونکر ممکن ہے ؟

۱۹۵۶ء

وحشتؔ کلکتوی کے کچھ اشعار

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا تھا عافیت ساحل میں ہے

نہ شوقِ میکدہ چھوٹا نہ سودائے صنم چھوٹا
ہمیں جس شغل کا چسکا پڑا وہ ہم سے کم چھوٹا

ہمارے پاؤں میں تو تم نے زنجیرِ وفا ڈالی
تمہارے ہاتھ سے کیوں رشتۂ مہر و کرم چھوٹا

وہ کام میرا نہیں جس کا نیک ہو انجام
وہ راہ میری نہیں جو گئی ہو منزل کو

اپنا بھی وہی حال ہوا راہِ وفا میں
جو حال ہوا کرتا ہے اربابِ وفا کا

حالِ چمن خزاں میں بھی ایسا کبھی ہوا نہ تھا
اپنا جو حال ہو گیا رنگِ بہار دیکھ کر

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

دل والے ہیں واقف مری بربادیٔ دل سے
ہر چند کہ یہ واقعہ مشہور نہیں ہے

مجال ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی
خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

اللہ رے مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے
جو بار اٹھانا پڑتا ہے کیونکر وہ اٹھایا جاتا ہے

جگر صاحب سے چند ملاقاتیں

جب سے پاکستان بنا ہے ڈھاکے میں ہر سال کم سے کم دو بڑے مشاعرے ہوتے رہے ہیں۔ ایک یوم اقبال کی تقریب میں۔ دوسرا پاکستان کی سالگرہ کے موقع پر۔ ان مشاعروں کے سلسلے میں جگر صاحب اب تک کئی مرتبہ ڈھاکے تشریف لا چکے ہیں اور جب کبھی وہ یہاں آئے مجھے ان سے ملنے کا موقع ضرور ملا۔ لیکن ان ملاقاتوں پر اصغر کا یہ مصرع صادق آتا رہا ؎

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا

مگر اب کے یوم اقبال کے سلسلے میں جگر صاحب یہاں آئے تو مجھے ان سے نہ صرف "ملنے" کا موقع ملا بلکہ انھیں "دیکھنے" کا بھی۔ مشاعرے کے بعد جگر صاحب کسی کام سے کچھ عرصے تک یہاں ٹھہر گئے۔ اس دوران میں مجھے ان سے تین چار مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا ان تین چار ملاقاتوں میں مجھے ان کی شخصیت کی چند جھلکیاں نظر آئیں جو اب آپ کی نذر ہیں۔

اب کی بار جگر صاحب سے پہلی ملاقات میں سرور بارہ بنکوی اور عطاء الرحمٰن جمیل میرے ساتھ تھے۔ علیک سلیک کے بعد جب ہم سب لوگ

بیٹھ گئے تو جگر صاحب نے بٹوے سے پان کی ایک گلوری نکالی اور اسے کھانے سے پہلے جمیل کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "آپ لوگ روزے سے تو نہیں؟ میں تو روزہ نہیں رکھتا" جمیل نے نفی میں جواب دیا تو جگر صاحب نے ان کی طرف پان بڑھایا لیکن جمیل نے یہ کہہ کر پان لینے سے انکار کر دیا کہ میں پان نہیں کھاتا۔ اس پر جگر صاحب نے پوچھا "سگریٹ پیتے ہیں"؟ جمیل نے اثبات میں جواب دیا تو جگر صاحب نے ایک لڑکے سے گولڈ فلیک کا ایک پیکیٹ منگوا کر جمیل کی طرف بڑھایا۔ جمیل نے میری طرف بڑھا دیا اور میں نے سرور کی طرف۔ جگر صاحب باتوں میں مشغول رہے۔ کچھ دیر بعد انھیں خیال آیا کہ سگریٹ ہم میں سے کوئی بھی نہیں پی رہا ہے۔ اُنھوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "ارے صاحب سگریٹ پیجئے۔ کیا آپ نہیں پیتے؟" میں نے کہا "آپ سے جھوٹ کیوں بولوں۔ پیتا ضرور ہوں لیکن اس وقت پینا کیا ضرور"؟ اس پر جگر صاحب نے کہا "اچھا اچھا میں سمجھ گیا آپ کس نقطۂ نظر سے بات کر رہے ہیں مگر وہ ٹھیک نہیں۔ ہر زمانے میں اخلاق کی ہیئت بدلتی رہتی ہے اور میں تو چھوٹوں سے خاصی بے تکلفی روا رکھتا ہوں۔ یقین مانئے اگر میرا کوئی لڑکا ہوتا تو میں اس سے بھی مذاق کرتا"۔ یہ کہہ کر جگر صاحب اپنے مخصوص انداز میں ہنسنے لگے۔ ان جملوں کو سن کر جگر صاحب کے سامنے سگریٹ پینے میں میری اور جمیل کی جھجک دُور ہو گئی۔

اس ملاقات میں ہم لوگ جگر صاحب کے ساتھ آدھ پون گھنٹے بیٹھے ہوں گے۔ جیسا کہ گفتگو کا قاعدہ ہے بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ زیادہ تر باتیں جگر صاحب ہی کرتے رہے۔ ہم لوگ سُنتے رہے۔ بات چیت کے اس مختصر سے وقفے میں جگر صاحب کے کئی نظریات اور ان کی شخصیت کے کئی ایسے گوشے میرے سامنے آئے جن سے میں ان کے بارے میں بہت کچھ سننے اور پڑھنے کے باوجود ناواقف تھا۔ مثلاً انھیں اقبال کی شاعرانہ اور مفکرانہ عظمت کا تو اعتراف ہے لیکن وہ

اقبال کے خلوص کے کچھ زیادہ قائل نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال جزوی طور پر مخلص شاعر تھے۔ جگر صاحب مکمل طور پر اقبال کو مخلص اس لیے نہیں مانتے کہ ان کی زندگی اور شاعری میں ہم آہنگی نہ تھی جگر صاحب بڑی شدت کے ساتھ اس بات کے قائل ہیں کہ زندگی، زندگی سے بدلتی ہے۔ شعروادب سے زندگی میں نہ کوئی انقلاب برپا ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ ان کے نزدیک کسی قوم میں فنونِ لطیفہ کی غیر معمولی مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قوم زوال و انحطاط کے دور سے گزر رہی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ کوئی قوم اپنے مخصوص مزاج سے ہٹ کر ترقی کر ہی نہیں سکتی۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال نے شاعری سے جو کام لینا چاہا وہ فنونِ لطیفہ کے مزاج کے خلاف ہے۔

جگر صاحب بقول خود الفاظ بہت سنبھل کے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں ایک ایسا ٹھہراؤ ہوتا ہے جس سے ان کی خود اعتمادی اور خلوص دونوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کی باتیں سنتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اس پر اچھی طرح حاوی ہیں اور اس کی صداقت یا صحت پر انھیں پورا یقین ہے۔ ان کا اندازِ گفتگو کسی حد تک فلسفیانہ ہوتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی گفتگو خشک اور بے کیف ہوتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ظرافت اور مشاہدہ ———— بے ساختہ ظرافت اور زندگی کا گہرا مشاہدہ ——— ان کی گفتگو کے نمایاں خصوصیات ہیں۔ جگر صاحب بظاہر کھوئے کھوئے سے معلوم ہوتے ہیں اور انھیں دیکھ کر خیال آتا ہے کہ وہ اور جو کچھ بھی جانتے ہوں گفتگو کے فن سے یقیناً نا آشنا ہوں گے۔ وہ کسی سے نہ اپنی کہتے ہوں گے نہ اس کی سنتے ہوں گے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ لطف لے لے کر باتیں کرتے ہیں۔ اپنے طنزیہ اور مزاحیہ جملوں سے خود بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ دوسروں کی باتیں غور سے سنتے ہیں۔ دل چسپ فقروں پر خواہ وہ ان کے اپنے ہوں یا دوسروں کے مسکراتے ہیں۔ کھلکھلا کر ہنسنے میں البتہ بلند قہقہہ نہیں لگاتے۔

اس ملاقات کے دو تین دن بعد ۔ تؔرد نے جگرؔ صاحب کے اعزاز میں اپنے یہاں ایک نشست منعقد کی ۔ چائے کے بعد مشاعرہ شروع ہوا جب جگرؔ صاحب کی باری آئی تو اُنھوں نے دو مرصّع غزلیں سنائیں مزید کلام کی درخواست کی گئی تو ایک فارسی نعت سنانے پر آمادہ ہوئے ۔ نعت سنانے سے پہلے تمہید کے طور پر اُنھوں نے بتایا کہ وہ نعت کن حالات میں کہی گئی ہے اور اس میں کس قسم کے خیالات و نظریات کا اظہار کیا گیا ہے ۔ اگرچہ ان کی تمہید بڑی طویل تھی پھر بھی نہایت دل چسپی سے سنی گئی ۔ اس تمہید سے یہ بات واضح تھی کہ جگرؔ صاحب کی زندگی پر مذہبیت کا عنصر غالب ہے ۔ لیکن ان کی مجموعی شخصیت کا محور مذہبیت نہیں عقلیت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ حج کے لیے مکہ گئے تو وہاں بھی ان کے ذہن کا ہر گوشہ (انھیں کے الفاظ میں) شکوک و شبہات سے لبریز تھا ۔ وہ شکوک و شبہات مذہب اور خدا سے متعلق تھے ۔ تمہید کے بعد جب اُنھوں نے نعت سنائی تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ مولویانہ نعت نہیں بلکہ عارفانہ اور مفکرانہ نعت ہے جو بہت ہی ڈوب کر کہی گئی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ جگرؔ صاحب کی یہ نعت بالکل نئے انداز کی نعت ہے جس میں فکر و احساس اور عقیدت و شعریت کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جس کی مثال کہیں اور مشکل سے ملے گی ۔

اس نشست کے بعد جگرؔ صاحب سے تیسری ملاقات حلقۂ اربابِ ذوق کے جلسے میں ہوئی ۔ میں حلقے کا سکریٹری ہوں لیکن میں نے اُنھیں حلقے کے جلسے میں مدعو نہیں کیا تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ حلقے کے طریقِ کار سے جگرؔ صاحب جیسے لوگوں کو کوئی دل چسپی نہیں ہو سکتی ۔ لیکن شریف الحسن صاحب جو حلقے کے جلسے میں بڑی باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں جگرؔ صاحب کو اپنے ساتھ لیتے آئے ۔ اس دن جلسے کی صدارت جگرؔ صاحب ہی نے کی ، لیکن بڑی ردّ و قدح کے بعد ۔ اس جلسے میں الطاف گوہر نے ایک مقالہ پڑھا

جس کا موضوع ضیا جالندھری کا مجموعۂ کلام "سرِشام" تھا۔ لیکن اس میں ضمناً جدید شاعری سے متعلق کچھ باتیں زیرِ بحث آگئی تھیں۔ جب حاضرین جلسہ حسبِ دستور مقالے پر اظہارِ خیال کر چکے تو الطاف گوہر نے صدر سے اجازت لے کر اپنے بعض خیالات کی مزید وضاحت کی اور جدید شاعری پر جو اعتراضات کیے گئے تھے ان کا جواب دیا۔ الطاف گوہر صاحب کا جواب تشفی بخش ہو یا نہ ہو لیکن خیال انگیز ضرور تھا اور میں نے دیکھا کہ جگر صاحب اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اُنھوں نے الطاف گوہر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے ابھی جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ذہن پر ایک نقش چھوڑ جانے والے خیالات ہیں۔ ان سے سوچنے سمجھنے کی راہیں کھلتی ہیں۔ اگر اس قسم کے جلسوں سے یہ فائدہ نہ ہو تو ایسے جلسے بیکار ہیں۔ اپنا وقت اور اپنی انرجی ضائع کرنے سے کیا حاصل؟ الطاف گوہر کے مقالے کے بعد شریف الحسن کی غزل تھی۔ اس کے ایک شعر پر جگر صاحب نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ یہ شعر غزل کے مزاج سے ذرا بھی نسبت نہیں رکھتا۔ غزل کے شعروں میں تغزل کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس پر ایک صاحب نے کہا کہ اگر غزل میں تغزل کے سوا اور کچھ نہیں ہونا چاہیے تو پھر آپ نے اپنے کلام میں تصوف کو کیوں راہ دی؟ اس پر جگر صاحب نے اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ تغزل سے میری مراد یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے غزل کی زبان اور غزل کے لب و لہجے میں کہا جائے۔ مثلاً فیض ایک سیاسی شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کے بیشتر اشعار سیاسی خیالات کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی غزلوں میں تغزل پایا جاتا ہے۔

ان تین ملاقاتوں میں میں جگر صاحب کی شخصیت سے بہت متاثر ہو چکا تھا اس لیے قدرتی طور پر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ جب تک وہ ڈھاکے میں قیام پذیر ہیں ان سے کم از کم دو ایک مرتبہ اور مل لوں۔ ساتھ ہی ... خواہش یہ بھی تھی کہ جگر صاحب کی عنایت کردہ کوئی چیز میرے پاس یادگار رہے۔

اس باب میں ان کے اوٹوگراف سے بہتر اور کون سی چیز ہو سکتی تھی۔ میں ہر مشہور و ممتاز آدمی کا اوٹوگراف لینے کا قائل نہیں جس کی شخصیت سے متاثر ہوں اسی کا اوٹوگراف لینا پسند کرتا ہوں۔ ۵۰ء یا ۵۱ء میں جب میں کچھ عرصے کے لیے بمبئی گیا تو وہاں بھی اردو کے کئی مشہور و ممتاز ادیبوں سے ملا۔ ان سے ملنے کے قبل ان میں سے ہر ایک کا اوٹوگراف لینے کا خیال تھا چنانچہ میں نے ایک اوٹوگراف بک خریدی تھی جو وہاں کے ادیبوں سے ملنے کے بعد سادہ ہی رہی اور اب تک سادہ تھی۔ دراصل مجھے اوٹوگراف لینے کا شوق نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ شوق یا رسم کچھ بے معنی سی معلوم ہوتی ہے۔ محض شہرت کی بنا پر کسی سے اوٹوگراف لینا کیا معنی؛ لیکن میں جگر صاحب کا اوٹوگراف اس لیے نہیں لینا چاہتا تھا کہ وہ ایک مشہور و ممتاز شاعر ہیں۔ مجھے تو ان کی شخصیت نے متاثر کیا تھا اور میں چاہتا تھا کہ ان کی کوئی چیز میرے پاس یادگار رہے۔ چنانچہ ایک دن اپنی اوٹوگراف بک لے کر ان سے ملنے گیا۔ اب وہ حاجی متین احمد صاحب کے یہاں سے شریف الحسن صاحب کے یہاں اُٹھ آئے تھے اور مجھے ٹھیک سے معلوم نہ تھا کہ شریف الحسن صاحب کا مکان کہاں ہے۔ ان کے مکان کا جو پتا بتایا گیا تھا اس کی مدد سے وہاں تک نہ پہنچ سکا۔ آخر ناکام لوٹ آیا۔ واپسی میں سرور مل گئے جو وہیں جگر صاحب سے ملنے جا رہے تھے۔ چونکہ میں شریف الحسن صاحب کے مکان کی تلاش میں بہت تھک چکا تھا اس لیے مجھ میں سرور کے ساتھ دوبارہ ان کے یہاں جانے کی سکت نہ تھی۔ سرور نے کہا کہ اوٹوگراف بک مجھے دے دو۔ میں جگر صاحب سے اس پر کچھ لکھوا لوں گا۔ چنانچہ میں نے اوٹوگراف بک انھیں دے دی اُنھوں نے اس پر جگر صاحب سے کچھ لکھوانے سے پہلے انھیں اس اوٹوگراف بک کی تاریخ بھی سنا دی اور اوٹوگراف لینے کے مطابق میرا نظریہ بھی۔ جگر صاحب اوٹوگراف لینے کے متعلق میرا نظریہ سن کر بہت متاثر ہوئے۔

اور کہنے لگے کہ" بقول جوشؔ ملیح آبادی اوٹوگراف بک وہ اصطبل ہے جہاں گھوڑے اور گدھے ایک ساتھ باندھے جاتے ہیں۔ لیکن اس باب میں نظیر صاحب کا ذوق بہت ہی بلند معلوم ہوتا ہے"۔ جگرؔ صاحب نے سہری اوٹوگراف بک پر اپنے خوب صورت خط میں ایک دل پذیر قطعہ لکھ دیا۔ اس سے آپ بھی لطف اندوز ہوتے چلیں ؎

وسعتِ فکر و نظر بھی نہ مجھے راس آئی
ہر تبسم پہ جراحت کا گماں ہوتا ہے
ساز و مطرب کے کرشموں پہ نہ جانا کہ یہاں
اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے

آخری مرتبہ میں کلیم سہسرامی اور سیف حسن پوری کے ساتھ جگرؔ صاحب سے ملنے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے "صاحب! میں آپ کے اس جذبے کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ اوٹوگراف کے معاملے میں آپ کا ذوق واقعی لائقِ تحسین ہے" مشکور عظیم اور حبیب انصاری پہلے سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے جگرؔ صاحب نے کہا آپ لوگوں کے آنے سے پہلے سعادت حسن منٹو کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ ان سے لاہور میں صرف ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ کسی جلسے میں وہ اور میں دونوں شریک تھے جب جلسے میں آئے تو سیدھے میرے پاس پہنچے اور کہا کہ "میری ادبی کارگذاریوں کے متعلق آپ کے جو تاثرات ہیں انھیں ایک نظم کی شکل میں لکھ دیجیے"۔ اس بے محل فرمائش کی بنا پر میرے ذہن میں منٹو کے متعلق کوئی اچھا تاثر نہیں پیدا ہوا۔ دراصل میں کبھی ان کے افسانوں سے بھی متاثر نہ ہو سکا۔ ان کے برعکس کرشن چندر کے افسانوں کو پڑھ کر ان کے متعلق میرے ذہن میں اچھے تاثرات پیدا ہوئے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ کرشن چندر سے میری ملاقات کبھی ہوئی

یا نہیں۔ ممکن ہے بمبئی میں کبھی ان سے ملاقات ہوئی ہو۔ ہر حال میں تو کتابوں سے ادیبوں اور شاعروں کی شخصیت کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔ کوئی ادیب یا شاعر اپنی تحریروں میں اپنی شخصیت چھپا ہی نہیں سکتا۔ شعر و ادب میں لکھنے والے کی شخصیت جیسی ہوتی ہے ویسی ہی ظاہر ہو کے رہتی ہے۔ میں کسی مصنف کے اچھے یا برے ہونے کا اندازہ اس طرح کرتا ہوں کہ جب کوئی کتاب پڑھتا ہوں تو اپنی پوری ہستی کا جائزہ لیتا ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ اس کتاب نے مجھے کہاں کہاں چھوا اور اس نے میرے اندر کس قسم کے جذبات و خیالات کو برانگیختہ کیا۔

جگر صاحب کچھ اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ کبھی کبھی موجودہ افسانہ نگاروں کے افسانے بھی پڑھ لیتے ہیں۔ دوران گفتگو میں جوش ملیح آبادی کا ذکر آیا۔ ان کے متعلق جگر صاحب نے جو کچھ کہا اس سے اندازہ ہوا کہ وہ جوش کے متعلق کوئی بلند رائے نہیں رکھتے۔ جگر صاحب کی باتوں سے میں اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ وہ آدمی کو اخلاقی نقطۂ نظر سے اچھے برے کی کسوٹی پر پرکھنے کے باوجود بدوں سے نفرت نہیں کرتے۔ ان کے دل میں انسانی لغزشوں اور انسانی کمزوریوں سے ہمدردی کا بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ اس باب میں انھوں نے ایک بات بڑے پتے کی کہی۔ فرمایا آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو فطرتاً اچھے ہوتے ہیں لیکن مخصوص حالات کے زیر اثر برے بن جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو فطرتاً برے ہوتے ہیں لیکن ضرورتاً اچھے بن جاتے ہیں۔

ایک رسالے میں سیماب اکبر آبادی کے رسالہ "شاعر" آگرہ میں یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ جگر صاحب کس کے شاگرد ہیں۔ سیماب اکبر آبادی کا دعویٰ یہ تھا کہ جگر صاحب ان کے شاگردوں میں سے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ جگر صاحب نے داغ دہلوی سے کبھی اصلاح نہیں لی۔ میں نے جگر صاحب سے پوچھا

کر اس باب میں حقیقتِ حال کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ بھئی میں تو اپنے آپ کو کائنات کے ذرے ذرے کا شاگرد سمجھتا ہوں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں نے سیمآب صاحب سے کبھی اصلاح نہیں لی البتہ میں نے رسا رام پوری سے اصلاح لی ہے۔ جہاں تک داغ سے اصلاح لینے کا تعلق ہے میں نے ایک غزل ان کے پاس ضرور بھیجی تھی اور داغ نے اس پر اصلاح بھی دی تھی لیکن چونکہ میرے والد صاحب بعض وجوہ کی بنا پر داغ سے نفرت کرتے تھے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ میں نے داغ کے پاس اصلاح کے لیے غزل بھیجی ہے تو وہ مجھ پر بہت خفا ہوئے اس لیے میں نے داغ سے اصلاح کا سلسلہ جاری نہیں رکھا۔ میں نے کہا کہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ آپ سیمآب کے شاگرد ہیں "شاعر" میں آپ کی ایک ایسی غزل کا عکس بھی شائع ہوا تھا جو آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی اور جس پر سیمآب نے اصلاح دی تھی آخر یہ کیونکر ہوا۔ اس پر جگر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ تو بڑی آسان سی بات ہے۔ ابھی اُنھوں نے اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ حاضرین میں سے کسی نے کہا ہاں یہ تو بڑی آسان سی بات ہے۔ کسی کی غزل پر اصلاح دے کر عکس شائع کر دینے میں کیا دشواری ہے۔ جگر صاحب نے "شاعر" کے لیے غزلیں بھیجی ہوں گی۔ سیمآب نے انھیں میں سے ایک غزل پر اصلاح دے کر اس کا عکس شائع کر دیا۔" جگر صاحب نے اس خیال کی تردید نہیں کی۔ میرے دوست کلیم سہسرامی نے پوچھا کہ آپ اصغر صاحب (گونڈوی) کے شاگرد کس حیثیت سے ہیں۔ کیا آپ نے ان سے بھی اصلاح لی ہے۔ جگر صاحب نے کہا کہ میں نے اصغر صاحب سے اپنے اشعار پر تو کبھی اصلاح نہیں لی لیکن میری زندگی میں جو انقلاب آیا وہ اُنھیں کے فیضان کا نتیجہ ہے۔

اتنا لکھ چکا تھا کہ مجھے جگر صاحب سے کئی سال پہلے کی ایک ملاقات کا ایک دل چسپ واقعہ یاد آگیا۔ جگر صاحب کسی مشاعرے ہی کے سلسلے میں ڈھاکے آئے ہوئے تھے اور فضلی صاحب کے یہاں قیام پذیر تھے۔

، دن شادانی صاحب، فضلی صاحب اور جگر صاحب سے ملنے جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ فضلی صاحب کے یہاں ہم لوگ پہنچے تو دیکھا کہ ڈرائینگ روم میں فضلی صاحب اور جگر صاحب کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے جن میں ایک شاعرہ بھی تھیں۔ فضلی صاحب نے چاہا کہ شاعرہ اور شاعروں کی موجودگی سے کچھ فائدہ اُٹھایا جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک صاحبہ سے تازہ کلام سنانے کی درخواست کی۔ انھوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ جگر صاحب عورتوں کی شاعری پسند بھی نہیں کرتے۔ اس پر جگر صاحب نے کہا کہ ہاں یوں تو میں عورتوں کا شعر کہنا پسند نہیں کرتا لیکن اس وقت آپ کچھ ضرور سنا دیجئے۔ اس پر کسی نے جگر صاحب سے پوچھا۔ آپ عورتوں کی شعر گوئی کے مخالف کیوں ہیں۔ جگر صاحب نے جواب دیا عورت بذات خود ایک شعر ہے۔ شعر کا شعر کہنا کیا معنی؟

اگست ۱۹۵۵ء

ڈاکٹر عندلیب شادانی

میرے والدین ۱۹۴۷ء کے اواخر میں اپنے وطن بہار کو خیر باد کہہ کر ڈھاکے آ گئے تھے۔ میں اس وقت گورکھپور میں ایف اے کا طالب علم تھا۔ جب میں ایف اے کے فائنل امتحان سے فارغ ہو کر جون ۱۹۴۸ء میں ڈھاکے آیا تو میرے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ آئندہ تعلیم کے لیے اپنی دیرینہ آرزو کے مطابق علی گڑھ جاؤں یا والدین کے اصرار کے مطابق یہیں رہ جاؤں۔ ہندوستان اور حیدرآباد کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کے باعث فیصلہ اور بھی دشوار ہو گیا تھا۔ اسی کشمکش کے عالم میں میں نے سوچا کہ چلو شادانی صاحب سے مل لو ممکن ہے ان سے مل کر اپنا مسئلہ حل ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف اپنا مسئلہ حل کرنے کے لیے میں نے ان سے ملنا چاہا۔ دراصل ایک مدت سے میرے دل میں شعر و ادب کے دوسرے باکمالوں کی طرح انھیں بھی دیکھنے اور ان سے ملنے کی آرزو موجود تھی۔ اپنی تعلیم کے معاملے میں ان کے مشوروں سے مستفید ہونے کا خیال ان سے ملنے کا مزید بہانہ ثابت ہوا۔

ایک دن اپنے ایک عزیز کے ساتھ شادانی صاحب سے ملنے کی مہم سر کرنے کے لیے صبح دس گیارہ بجے گھر سے نکل پڑا۔ خاصا چکر لگانے کے بعد جب ہم دونوں اس بنگلے کے گیٹ تک پہنچ گئے جسے شادانی صاحب کی قیام گاہ

بتایا گیا تھا تو ہم گیٹ کے پاس پہنچ کر رک گئے اور اس کا انتظار کرنے لگے کہ کوئی شخص ہم سے کہے کہ آپئے اندر آجایئے ۔ اتنے میں گیٹ کے سامنے والے کمرے سے ایک صاحب نکل کر برآمدے میں آ گئے ۔ کرتے اور پائجامے میں ملبوس، آنکھوں پر عینک، پاؤں میں چپل، صاف رنگ، چھریرا جسم، نکلتا ہوا قد، انھوں نے ایک لمحہ ہم دونوں کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے کچھ پوچھنا چاہتے ہو تو پوچھ لو لیکن چونکہ ہم خود پوچھے جانے کے منتظر تھے، اس لیے خاموش رہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صاحب مڑکر پاس کے تخت پر بیٹھ گئے اور بکھرے ہوئے کاغذات کا مطالعہ کرنے لگے ۔

میں نے اپنے عزیز سے کہا "غالباً شادانی صاحب یہی ہیں ۔ آپ یہیں ٹھہریئے میں پوچھ کر آتا ہوں" چنانچہ گیٹ کھول کر ڈرتا، جھجکتا برآمدے میں گیا ۔ ان صاحب نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں نے سلام کیا اور کہا "میں شادانی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں ۔ سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے دھیمی آواز میں بولے "MYSELF SHADANI" میں نے کہا قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا ہوں ۔ انھوں نے فوراً میرے شانے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر مجھے اپنے قریب بٹھا لیا اور مجھ سے وہ تمام باتیں پوچھنے لگے جو ایسے موقع پر کسی اجنبی سے پوچھی جاتی ہیں ۔ میں نے جواب دینے سے پہلے اپنے عزیز کو برآمدے میں بلا کر اپنا اور ان کا تعارف کرا دیا ۔ شادانی صاحب بڑے لطف و مرحمت کے ساتھ گفتگو کرتے رہے لیکن شعر و ادب سے متعلق کوئی بات نہ ہوئی، گو اس وقت وہ کوئی ادبی ہی کام کرنے بیٹھے تھے ۔ ان کے سامنے جو کاغذات بکھرے ہوئے تھے ان پر ادھر ادھر نظر ڈالنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لکھنوی شاعری کے متعلق کچھ لکھ رہے تھے ۔ دراصل یہ وہی مضمون تھا جو کئی سال بعد "لکھنوی شاعری کی چند خصوصیات" کے عنوان سے "نگار" میں شائع ہوا ۔ اگرچہ ان کی باتوں میں یہ اشارہ کہیں بھی نہ تھا کہ اچھا بھئی اب تم جاؤ اس وقت مصروف ہوں پھر کبھی آجانا، تاہم میں

دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرا۔

پہلی ملاقات میں شادانی صاحب کی دو چیزوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ایک تو ان کی شفقت آمیز پذیرائی نے، دوسرے ان کی خوش گفتاری نے۔ گزشتہ دس بارہ سال کے اندر میں نے انھیں ہر اجنبی کے ساتھ خواہ وہ کسی طبقے یا کسی درجے کا ہو اسی خوش دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے دیکھا ہے جو پہلی ملاقات میں مجھ سے روا رکھی گئی تھی۔ ان کے متعلق یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ وہ اپنے نئے ملنے والوں کی پذیرائی میں بچھ بچھ جاتے ہیں کیونکہ عموماً وہ اپنے ملنے والوں کو نہ تو چائے سے پوچھتے ہیں نہ پان سے نہ سگریٹ سے لیکن اس کے باوجود وہ اجنبیوں سے اس طرح ملتے ہیں جیسے وہ ان پر یا ان کے وقت پر بار نہیں ہیں۔ ان کی گفتگو شروع تو ہوگی رسمی باتوں ہی سے لیکن ان باتوں میں بھی بظاہر ایسا خلوص ہوگا کہ ان کے رسمی ہونے کا احساس پیدا ہی نہ ہوگا۔ لفظ 'بظاہر' میں نے اس لیے استعمال کیا کہ ظاہر ہے ہر اجنبی کے ساتھ اخلاق برتنا جس قدر آسان ہے اخلاص برتنا اتنا ہی مشکل۔ لیکن شادانی صاحب کی ایک صفت یہ ہے کہ ان کے اخلاق پر اخلاص کا گمان ہونے لگتا ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ اپنے ملنے والوں سے بڑی خندہ پیشانی اور خوش دلی سے باتیں کرتے ہیں۔

بعض بڑے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے ملنے جائیے تو محسوس ہوگا جیسے یک طرفہ ملاقات ہو رہی ہے یا یہ کہ دو شریف آدمیوں کے درمیان ملاقات نہیں ہو رہی ہے بلکہ قوم کے لیڈر اور اخبار کے رپورٹر کے درمیان انٹرویو ہو رہا ہے۔ آپ نے کچھ پوچھا تو اُنھوں نے جواب دے دیا۔ نہ پوچھا تو نہایت بدنما قسم کی خاموشی طاری ہے۔ شادانی صاحب سے ملاقات کے دوران یہ صورتِ حال کبھی پیش نہیں آنے پاتی۔ ان سے ملنے والا کتنا ہی کم سخن اور شرمیلا کیوں نہ ہو وہ اس مسئلے سے ہرگز دوچار نہ ہوگا کہ اب کیا کہیں اور کیا پوچھیں۔ شادانی صاحب اپنے ملنے والے کی دو چار باتوں سے گفتگو کا کوئی موضوع نکال

لیں گے اور اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کہتے چلے جائیں گے۔ بیچ بیچ میں ملاقاتی کو بھی کچھ کہنے کا موقع دیتے رہیں گے اس بات کے درپے ہرگز نہ ہوں گے کہ ملنے والا انھیں بڑا ذہین اور ظریف مان کر اُٹھے۔ مگر ان کی باتیں ذہانت اور ظرافت سے خالی کبھی نہ ہوں گی۔ شادانی صاحب کی ظرافت، برجستہ جوابی سے زیادہ بذلہ سنجی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ان کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ لوگوں پر فقرہ چست کرنے کی بجائے لطیفہ چست کرتے رہتے ہیں۔ انھیں لطیفے بے شمار یاد ہیں اور بر محل یاد آتے ہیں۔ ان کی صحبت میں کوئی شخص کوئی لطیفہ سنائے تو کہیں گے ارے صاحب یہ تو کچھ بھی نہیں، پھر وہ اسی انداز کا مگر اس سے زیادہ دل چسپ لطیفہ سنائیں گے۔ ایک شام میں ان کے گھر پر بیٹھا بات چیت کر رہا تھا۔ ان کی بھتیجی انجم (جو اس وقت تک ان کی بہو نہیں بنی تھیں) بھی موجود تھیں۔ موضوعِ گفتگو کی مناسبت سے میں نے شادانی صاحب کو ایک لطیفہ سنایا۔ حسبِ معمول اُنھوں نے اپنی مخصوص تمہید کے ساتھ اس سے بہتر لطیفہ سنانا چاہا تو انجم چڑ کر بولیں "پاپا آپ کبھی تو کوئی لطیفہ خوشی اور حیرت کے ساتھ سُن لیا کیجیے"۔ اس جملے سے ہم سبھی محظوظ ہوئے اور شادانی صاحب کچھ دیر تک فخر کی ہنسی ہنستے رہے۔

شادانی صاحب اپنی گفتگو میں لطیفے تو کثرت سے بیان کرتے ہیں لیکن ایسے فقرے بہت کم کہتے ہیں جن میں لطیفوں کی سی خوبصورتی، دل چسپی اور یاد رہ جانے کی صلاحیت ہو۔ بہر حال اس وقت مجھے ان کا ایک فقرہ یاد آرہا ہے جو برسوں سے میرے ذہن میں پیوست ہے۔ ہوا یہ کہ آج سے کئی سال پہلے پاکستان کی مرکزی حکومت کی طرف سے ڈھاکا یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام اردو کا کورس ان بنگالی طلبہ کے لیے قائم کیا گیا جو مدرسۂ عالیہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ اُنھیں اردو میں اتنی مہارت حاصل ہو جائے کہ مدرسوں اور اسکولوں میں اردو کے مدرس کے فرائض انجام دے سکیں اور اس طرح ان کے کسبِ معاش کی ایک صورت نکل آئے۔ باوجود اس کے کہ مدرسوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہی ہے

بنگالی طلبہ کی اردو بہت کمزور ہوتی ہے ۔ میں اس زمانے میں بی ۔ اے کا طالب علم تھا ۔ ایک دن شام کے چار بجے جب یونیورسٹی کی کلاسیں ختم ہو چکیں تو شادانی صاحب اپنے بعض رفقائے کار کے ساتھ شعبے سے نکلے اور گھر کی طرف چلے ۔ میں ان حضرات کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا ۔ اس زمانے میں متذکرہ طلبہ کا امتحان ہوا تھا ۔ شادانی صاحب اور ان کے رفقائے کار ان طلبہ کے امتحان کے نتائج کے بارے میں باتیں کر رہے تھے ۔ جب شادانی صاحب نے سنا کہ طلبہ کی اکثریت نے پرچے بہت خراب کیے ہیں تو انھوں نے کہا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان طلبہ کے نتائج کس طرح پیش کیے جائیں اگر یہ پاس نہ کریں تو بُرا ہے اور پاس کر جائیں اور زیادہ بُرا ہے ۔

شادانی صاحب کی موجودگی کسی بزم کو بے کیف نہیں ہونے دیتی ۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی اجتماع میں بدنما خاموشی کے راہ پانے کا امکان نہیں ۔ بات بات پر کوئی لطیفہ یا واقعہ یا کہانی بیان کر کے لطفِ صحبت کو برقرار رکھنے کا جیسا سلیقہ انھیں آتا ہے وہ ادیبوں اور شاعروں میں بھی کم یاب ہے ۔ ان کی آواز اتنی صاف ستھری دل کش اور دُور رس واقع ہوئی ہے کہ بات شروع کرتے ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور اپنی خوش گفتاری کے سہارے طویل کہانی بھی اس قدر خود اعتمادی اور خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والوں کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے ۔ کسی جلسے یا مشاعرے کی صدارت کوئی اور کر رہا ہو جب بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز شادانی صاحب ہی رہا کرتے ہیں اور اگر وہ خود صدارت کے فرائض انجام دے رہے ہوں تو صبر آزما شاعروں اور مقرروں کے باوجود سامعین کو نہ بے کیف ہونے دیتے ہیں نہ بے قابو ۔ خصوصاً مشاعروں کی صدارت میں ان کی دو چیزیں سامعین کو شعرا کے کلام سے بھی زیادہ مزا دے جاتی ہیں ۔ ایک تو شعرا کا تعارف ، دوسرے انھیں کی زمینوں میں فی البدیہہ اشعار ۔

شادانی صاحب مشاعرے کے کامیاب صدر ہی نہیں کامیاب شاعر

بھی ہیں۔ اچھے سے اچھے شاعر کا مشاعرے کے نقطۂ نظر سے کامیاب شاعر ہونا ضروری نہیں۔ لیکن قدرت کی فیاضیوں نے شادانی صاحب کو اپنے زمانے کا ایک ممتاز شاعر بنانے پر قناعت نہیں کی بلکہ انھیں اس نعمت سے بھی نوازا جس کے بغیر آج کل خوش گو شعرا بھی مشاعروں سے بے آبرو ہو کر لوٹتے ہیں۔ شادانی صاحب کو کبھی اپنی خوش آوازی پر ناز تھا۔ اپنی اس آواز کے مقابلے میں جو ان کا ساتھ چھوڑ چکی ہے وہ اپنی موجودہ آواز کو یکسر ہیچ سمجھتے ہیں۔ لیکن آج تک وہ پڑھتے ترنم ہی سے ہیں۔ ان کے پڑھنے کا انداز ایسا ہے جو نہ کسی اور کے انداز کی تقلید ہے اور نہ جس کی تقلید کوئی اور کر سکتا ہے۔ اگرچہ ان کے موجودہ ترنم میں کوئی دلکشی اور دل کشائی باقی نہیں لیکن اتنی جان اب بھی ہے کہ اسے سُننے کے بعد خُدا سے یہ دُعا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ خدایا انھیں تحت اللفظ پڑھنے کی توفیق عطا کر۔ جس طرح وہ جذبات میں ڈوب کر شعر کہتے ہیں اسی طرح جذبات میں ڈوب کر پڑھتے بھی ہیں۔ ان کی شاعری کا عاشقانہ رنگ اور ان کے پڑھنے کا والہانہ طرز دونوں کی ہم آہنگی مشاعروں میں تاثیر و تاثر کی وہ فضا چھوڑ جاتی ہے جس سے لطف اندوز ہونا اتنا ہی آسان ہے جتنا اسے بیان کرنا دشوار۔

شادانی صاحب اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں خوش گفتار ہونے کے علاوہ بڑے اچھے مقرر بھی واقع ہوئے ہیں۔ اس باب میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فارسی اور انگریزی میں ان کی گفتگو اور تقریر اردو سے کسی طرح کم رواں اور فصیح نہیں ہوتی۔ ڈھاکے میں انھیں فارسی بولنے اور لکھنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑتی یہاں تک کہ بی اے آنرز اور ایم اے کے طلبہ کو فارسی پڑھاتے وقت بھی نہیں۔ اس کے باوجود جب وہ دو مرتبہ پاکستانی وفد کے ساتھ ایران گئے یا ڈھاکے میں شاہ ایران کی تشریف آوری کے زمانے میں بعض ایرانی افسروں اور شاعروں سے گفتگو کا موقع آیا یا کبھی کبھار ڈھاکے میں ایرانی سفیر سے ملنا ہوا تو ان مواقع پر انھوں نے فارسی میں اسی سہولت اور سلاست کے ساتھ گفتگو کی جو اہلِ زبان کا

حصہ ہے۔ ان کے ایک رفیق کار ایک سال ایران رہ کر آئے۔ وہاں رہنے کے اثر سے فارسی میں ان کی زبان خاصی رواں ہوگئی۔ ان کی واپسی کے دو تین سال بعد شادانی صاحب کو ایک مرتبہ ایرانی سفیر کو اپنے گھر پہ مدعو کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس صحبت میں اُنھوں نے اپنے دو رفقائے کار کو بھی شریک کر لیا۔ ان میں سے ایک وہ تھے جو کبھی ایران تو نہیں گئے لیکن عربی اور فارسی کے مشہور عالموں اور اردو کے ممتاز ادیبوں میں سے ہیں۔ دوسرے وہ جو ایک سال ایران رہ کر آئے تھے۔ اس تقریب میں ایرانی سفیر سے ساری گفتگو شادانی صاحب کو کرنی پڑی۔ ان کے دونوں رفیق کار سامعین کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جب ایرانی سفیر چلا گیا تو ان صاحب نے جنھیں ایران سے آئے ہوئے دو تین ہی سال ہوئے تھے، شادانی صاحب سے کہا کہ صاحب آج مجھے محسوس ہوا کہ فارسی بولنے کی تھوڑی سی مہارت جو میں نے ایران میں حاصل کی تھی ڈھاکے آکر کھو چکا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اپنی مہارت کیونکر برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

شادانی صاحب فارسی میں صرف گفتگو کرنے پر قادر نہیں، انھیں فارسی میں تقریر کرنے اور فی البدیہہ شعر کہنے پر بھی قدرت حاصل ہے اور اس قدرت کا مظاہرہ خود ایران میں کر آئے ہیں۔ پاکستانی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے اُنھوں نے ایران کی سیر کے مختلف مواقع پر جو فی البدیہہ اشعار کہے اُنھیں میرے مضمون "شادانی صاحب کی بدیہہ گوئی" میں ملاحظہ فرمائیں۔

شادانی صاحب نے انگریزی پرائیویٹ طریقے پر پڑھی۔ لیکن اس زبان میں بھی ان کی گفتگو اور تقریر اتنی ہی رواں ہوتی ہے جتنی انگریزی کے کسی سند یافتہ فاضل اور کہنہ مشق مقرر کی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک بلند پایہ مقرر ہی نہیں باکمال مباحث بھی ہیں اور اس حیثیت سے شہر کے تعلیمی حلقوں اور تہذیبی اداروں میں نہایت مقبول و محترم ہیں۔ کسی مباحثے میں ان کی شرکت مباحثے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس دن کا ایک واقعہ بن جاتی ہے۔ یوں تو ان کی برجستہ تقریریں

بھی پُرلطف اور پُرمغز ہوتی ہیں لیکن جب اُنھیں کسی مقررہ پروگرام کے تحت کسی متعینہ موضوع پر تقریر کرنا ہوتی ہے یا مباحثے میں حصہ لینا ہوتا ہے تو وہ اپنے موضوع سے متعلق مواد کی فراہمی میں خاصی محنت کرتے ہیں۔ کتابوں کے مطالعے ذاتی غور و فکر اور دوسروں سے تبادلۂ خیال کی بدولت انھیں جتنے نکات و دلائل ہاتھ آتے ہیں، کاغذ پر نوٹ کرتے جاتے ہیں۔ تقریر کرتے یا مباحثے میں بولتے وقت اس کاغذ کو سامنے رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں کی طرح ان کی تقریریں بھی مختصر ہوں یا طویل شروع سے آخر تک دل چسپ اور جاذبِ توجہ ہوتی ہیں۔ جہاں اپنے موضوع کی موافقت میں ان کے دلائل نہایت مضبوط اور منطقی ہوتے ہیں وہاں مخالفین کے نقطۂ نظر اور طریقِ استدلال پر ان کی ضرب کاری اور ان کا وار بھر پور ہوتا ہے۔ اپنے مضامین کی طرح اپنی تقریروں میں بھی وہ دُنیا کے مشہور ادیبوں اور مفکروں کے افکار و اقوال کے حوالے کم دیتے ہیں یا بالکل نہیں دیتے البتہ ان کی کوئی تقریر دل چسپ مثالوں اور لطیفوں سے خالی نہیں ہوتی۔ ان کی مثالیں اور ان کے لطیفے صرف ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم نہیں کرتے بلکہ زبردست منطقی حربے کا کام دیتے ہیں۔

شادانی صاحب پیشے کے اعتبار سے پروفیسر ہیں لیکن اگر وہ پروفیسر نہ بھی ہوتے جب بھی دیکھنے میں پروفیسر ہی معلوم ہوتے۔ شاید یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آ رہی ہو اور میں ٹھیک سے اس کی وضاحت بھی نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھیے کہ جس طرح بعض آدمیوں کی صورت شکل، وضع قطع، طور طریق رفتار و گفتار اور حرکات و سکنات کو دیکھ کر ان پر مفکر یا شاعر ہونے کا گمان ہوتا ہے حالانکہ ان خصوصیات کے اعتبار سے یہ بات مقرر نہیں ہے کہ مفکروں یا شاعروں کو ایسا یا ویسا ہونا چاہیے، اسی طرح شادانی صاحب کو دیکھ کر ان پر پروفیسر ہونے کا گمان ہوتا ہے، یہ اور بات کہ حسنِ اتفاق سے وہ پروفیسر ہیں بھی۔

شادانی صاحب شعبۂ اردو و فارسی کے صدر اور سینئر پروفیسر ہونے کے باعث تین مرتبہ تین تین سال کے لیے فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین بھی رہ چکے ہیں۔

ڈین کی حیثیت سے اُنھیں یونیورسٹی کے سارے اساتذہ اور طلبہ (جن کا تعلق آرٹس سے تھا) سے سابقہ پڑتا تھا۔ وہ ان کے معاملات و مسائل سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے تھے۔ دفتر ہی نہیں گھر پر بھی اساتذہ اور طلبہ کی یورش رہا کرتی تھی۔ اساتذہ اپنے اپنے شعبے یا اپنی اپنی تنخواہ و ترقی سے متعلق مسائل لے کر پہنچتے اور ان مسائل کے حل میں شادانی صاحب کی مدد کے طالب ہوتے۔ طلبہ عموماً امتحان کی تاریخ کے آگے بڑھانے کا مسئلہ لے کر آتے۔ آپ جانتے ہیں کہ اساتذہ سے نبٹنا اتنا دشوار نہیں جتنا طلبہ سے، خصوصاً اس دَور کے طلبہ سے جو ہر وقت ہڑتال اور ہنگامے کے موڈ میں رہا کرتے ہیں اور جس سے ناراض ہو جاتے ہیں اس کا جیتے جی جنازہ تک نکال دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے جب کبھی شادانی صاحب کے دفتر یا گھر پر طلبہ کے ہجوم کو آتے دیکھا تو گھبرا گیا کہ نہ جانے ان کی جلو میں کون سی آفت شادانی صاحب کے سر پر آنے والی ہے لیکن میں نے خود شادانی صاحب کو کبھی گھبراتے نہ دیکھا۔ طلبہ کا وفد نرم لہجے میں گفتگو کر رہا ہو یا گرم لہجے میں شادانی صاحب اطمینان و اعتماد کا دامن کبھی نہ چھوڑتے۔

ایک ایسے ہی موقع کا ذکر ہے میں شعبۂ اردو میں بیٹھا ہوا تھا۔ شادانی صاحب کے علاوہ دوسرے اساتذہ بھی موجود تھے۔ ٹفن کا گھنٹہ بجتے ہی تقریباً دس بارہ طلبہ کا گروہ شعبے میں در آیا اور کسی قدر بپھرے ہوئے انداز میں اپنی شکایت بیان کرنے لگا۔ ایک کا جملہ ختم ہوتے ہی دوسرا پہلے طالب علم کی تائید میں بولنا شروع کر دیتا۔ خلاصۂ فریاد یہ تھا کہ چونکہ نماز پڑھنے کا کمرہ طالبات کے کومن روم کے مقابل ہے اس لیے لڑکیوں کی چیں چیں میں میں سے نماز پڑھنے میں خلل اندازی ہوتی ہے۔ شادانی صاحب نے اُنھیں یقین دلایا کہ یا تو نماز کا کمرہ بدل دیا جائے گا یا طالبات کا کومن روم۔ اس کے بعد اُنھوں نے کہا مگر آپ لوگ ایک لطیفہ سُنتے جائیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص کسی میدان میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کے سامنے سے مجنوں کا گزر ہوا۔ نمازی جلدی سے نماز ختم کر کے مجنوں کو ملامت کرنے لگا کہ

کہ دیکھتا نہیں میں نماز پڑھ رہا ہوں اور تو میرے سامنے سے گزر گیا۔ اس پر مجنوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا میں تو اپنے مجازی محبوب (لیلیٰ) کے خیال میں اس قدر محو تھا کہ مجھے اپنے اردگرد کا احساس باقی نہ رہا۔ تعجب ہے کہ تجھے محبوب حقیقی کے حضور میں کھڑے ہوئے ہونے کے باوجود میرے گزرنے کا احساس کیونکر ہوا۔ یہ لطیفہ سن کر تمام طلبہ کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی جیسے وہ مذکورہ بالا شکایت سے کہ آنے پر شرمندہ بھی ہوں اور ایک بڑے پتے کی بات سیکھ کر واپس جانے پر شاداں بھی۔

ملنے ملانے کے معاملے میں شادانی صاحب بڑے ارزاں اور سہل یاب ہیں جس کا جی چاہے اور جس وقت جی چاہے ان سے گھر پر یا یونیورسٹی جا کر مل لے۔ چنانچہ اکثر ان کے یہاں طلبہ، اساتذہ، اجنبی اور احباب کا تانتا بندھا رہتا ہے جو انھیں اتنی مہلت بھی نہیں دیتے کہ وہ اپنے لکھنے پڑھنے کے لیے کوئی وقت مخصوص کرلیں۔ کبھی کبھی تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ ریڈیائی تقریر میں صرف ایک دن یا چند گھنٹے باقی رہ گئے اور تقریر تیار نہ ہو سکی۔ ایسے نازک موقعوں پر میں نے انھیں اپنے پڑوسی ہادی صاحب (ڈھاکا یونیورسٹی کے رجسٹرار) کا کمرہ دو ایک گھنٹے کے لیے مستعار لیتے یا پھر دھان منڈی (شادانی صاحب کی قیام گاہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک علاقہ ہے جہاں وہ اپنا مکان بنوا رہے تھے) جا کر پناہ گزیں ہوتے پایا۔ ملاقاتیوں کے اس مسلسل حملے کی روک تھام کے لیے ایک مرتبہ انھوں نے "ملاقات کے اوقات" کی تختی برآمدے میں لگا دی لیکن اس تختی کا وہی حشر ہوا جو ہمارے یہاں بہت سے قوانین کا ہوا کرتا ہے یعنی لوگ اپنے چلن کو قانون بنا لیتے ہیں۔ قانون کو چلن نہیں بننے دیتے۔

جس طرح معمولی سے معمولی آدمی کے لیے شادانی صاحب تک رسائی مشکل نہیں اسی طرح معمولی سے معمولی ادبی جلسوں اور مشاعروں میں انھیں شرکت

یا سدارت پر آمادہ کر لینا بھی دشوار نہیں - ان کی یہ وسیع الاخلاقی بعض اوقات خود مجھ پر گراں گزرتی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کاش وہ اس قدر ارزاں اور سہل یاب نہ ہوتے - ان کے جاننے والے اور ماننے والے معاشرتی، اقتصادی اور ادبی اعتبار سے کتنی ہی معمولی سطح کے لوگ کیوں نہ ہوں وہ حتی الامکان ان کی تالیفِ قلب کا لحاظ رکھتے ہیں - میں نے انھیں ڈھاکے کے ایسے ادیبوں اور شاعروں کی عیادت کے لیے جاتے دیکھا ہے جن کی ادبی شہرت اور اہمیت ڈھاکے تک محدود ہے یا اتنی بھی نہیں - اس میں شک نہیں کہ یہ خوبی اور اس قسم کی خوبی ہر اچھے انسان میں ہونی چاہیے لیکن عام طور پر ان لوگوں میں کہاں ہوتی ہے جو شادانی صاحب کے مقام اور مرتبے کو پہنچ جاتے ہیں -

شادانی صاحب دُبلے پتلے نازک ساخت اور کمزور جسم کے آدمی ہیں - اس کے باوجود ان میں نہ جسمانی ہمت کی کمی ہے اور نہ اخلاقی جرأت کی - لوگوں کو ان کی اخلاقی جرأت کا ثبوت ان کی تحریروں میں بھی ملتا رہا ہے اور ان کی تقریروں میں بھی - ان کے ادبی فیصلوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان فیصلوں میں جو اخلاقی جرأت پائی جاتی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا - یہ صحیح ہے کہ انھیں اپنی اخلاقی جرأت کی بدولت کبھی جیل جانے یا سنگسار ہونے کی نوبت نہیں آئی مگر یہ کیا کم ہے کہ وہ اپنے برابر والوں اور اپنے سے بڑوں کے درمیان ہوا کا رُخ دیکھ کر بات نہیں کرتے بلکہ وہ سب کچھ کہہ گزرتے ہیں جو ان کے ضمیر کا تقاضا ہوتا ہے - ایک مرتبہ ڈھاکا یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر (ڈاکٹر محمود حسن) ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر پر آئے تھے - قدرتی طور پر ڈھاکا یونیورسٹی کے بعض معاملات کا ذکر چھڑ گیا - اس سلسلے میں شادانی صاحب نے انھیں ایک واقعہ سنایا کہ جب یونیورسٹی کے فلاں پروفیسر نے ایگزیکیوٹو کونسل کے جلسے میں اپنے ایک رفیق کار کے متعلق کہا کہ وہ فلاں عہدے (غالباً ریڈر شپ یا سینیر لکچررشپ) کے لیے موزوں نہیں ہیں کیونکہ انھیں تعلیمی زندگی سے علیحدہ ہوئے بیس برس ہو گئے اس دوران میں وہ اپنا

علم یقیناً بھول بھال گئے ہوں گے تو میں نے (شادانی صاحب) نے اُنھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا "اپنے ایک رفیق کار کے متعلق اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیے" اس پر پروفیسر موصوف نے کہا "لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ایک حقیقت ہے" جواب میں میں (شادانی صاحب) نے کہا " اگر یہ حقیقت ہے تو اس سے بدتر حقائق میں آپ کے متعلق جانتا ہوں"

ڈھاکے میں برٹش کونسل سنٹر کی طرف سے آئے دن مختلف موضوعات پر مباحثے یا تقریریں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک مرتبہ وہاں "مشرقی پاکستان کی تہذیب کے نئے میلانات" کے عنوان سے ڈھاکا یونیورسٹی کے کئی پروفیسروں کی تقریریں ہوئیں جن میں شادانی صاحب بھی تھے۔ جلسہ صوبائی اسمبلی کے اسپیکر کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ تمام مقررین ایسے میلانات کا ذکر کر رہے تھے جن کا تعلق مشرقی پاکستان کی تہذیب سے اتنا نہ تھا جتنا مقررین کے تخیل سے۔ جب شادانی صاحب کی باری آئی تو اُنھوں نے اپنی تقریر شروع کرتے ہوئے کہا کہ مجھے تو مشرقی پاکستان کی تہذیب میں کوئی نیا میلان نظر نہیں آتا۔ —————— لیکن اگر اس میں کوئی نیا میلان ہے تو یہ ہے کہ اب پہلے کی بہ نسبت شراب زیادہ پی جاتی ہے، جوا زیادہ کھیلا جاتا ہے، گھوڑ دوڑ جو پہلے بند تھی اب جاری ہو گئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے عوام سے لے کر خواص بلکہ حکومت کے حکامِ اعلیٰ تک کو رگڑ ڈالا۔ اور تو اور خود برٹش کونسل پر سخت نکتہ چینی کر گئے۔ ان کی اخلاقی جرأت کے اس مظاہرے سے سب لوگ دم بخود رہ گئے۔

اُونچے طبقے کے لوگوں کی طرف سے جسمانی ہمت کا اظہار بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اکثر حالتوں میں پڑھے لکھے شائستہ اور مہذب لوگوں کی طرف سے جسمانی ہمت کا اظہار ایک بد نما حرکت معلوم ہوتا ہے، لیکن ضرورت پڑ جائے تو شادانی صاحب اس سے بھی باز نہیں آتے۔ ایک مرتبہ وہ اپنی کار میں اپنی لڑکی اور بھتیجی کے ساتھ نیو مارکیٹ (ڈھاکے کا نیا بازار جو بازار سے زیادہ تفریح گاہ

کی حیثیت رکھتا ہے) گئے۔ واپسی پر دونوں لڑکیاں پچھلی سیٹ پر بیٹھیں۔ ڈرائیور اور شادانی صاحب اگلی سیٹ پر بیٹھے۔ جب کار چلنے لگی تو ایک آوارہ منش نوجوان نے جو کار کے سامنے سے گزر رہا تھا، شادانی صاحب کی لڑکی کا ہاتھ چھو دیا۔ ان کی بھتیجی نے سالن سے کہہ دیا۔ نوجوان کی اس حرکت پر شادانی صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ فوراً کار سے اُتر پڑے اور تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے نوجوان کو پکڑ کر پیٹنا شروع کر دیا۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ جب وہ نوجوان خُوب پٹ چکا تو لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے دونوں کو الگ کر دیا۔ تماشائی اس نوجوان کو زجر و ملامت کرنے لگے اور شادانی صاحب کار میں بیٹھ کر گھر چلے آئے۔ نوجوان پر پٹنے کا اثر کیا ہوا یہ تو وہ جانے لیکن اسے پیٹنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ شادانی صاحب کا ایک ہاتھ کلائی کے قریب سوج گیا اور کئی روز تک اس میں تکلیف رہی۔

زمانے کے ساتھ ساتھ انسان کے نہ صرف خارجی حالات بدلتے رہتے ہیں بلکہ مزاج و میلان میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ شادانی صاحب بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ میں نے اپنے گزشتہ دس گیارہ سالہ تعلقات کے دوران شادانی صاحب کو ہمیشہ معتدل مزاج پایا۔ لیکن غالباً وہ ہمیشہ ایسے ہی نہیں تھے کبھی ان کی طبیعت میں تیزی بھی تھی اور غُصّہ بھی۔ بعض اوقات اب بھی وہ تیزی و تندی اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔ رسالہ "خاور" کی ادارت کے زمانے میں ایک دن چپراسی کی کوتاہیوں سے برہم ہو کر اُنھوں نے میرے دوست ارشد کاکوی کی موجودگی میں کہا تھا کہ افسوس ہے اب بوڑھا ہو گیا ہوں ورنہ اس شخص کو درخت سے باندھ کر بُری طرح پیٹتا۔ اسی طرح جب کبھی وہ گھر کے ملازم یا دھوبی وغیرہ پر خفا ہوتے ہیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی مرمت کیے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ ایک مرتبہ ان کے باورچی نے انھیں پہلے سے اطلاع دیے بغیر یک بیک ملازمت چھوڑ کر ان کے یہاں سے جانا چاہا۔ اس پر وہ اس درجہ برہم ہوئے کہ میری اور ایک اور شخص کی موجودگی میں اسے مارنے کے لیے جوتا اُٹھا لیا۔ ہم دونوں نے بیچ بچاؤ کر کے انھیں خاموش کیا۔ اسی طرح

ایک دفعہ وہ اپنے گھر میں ہر وقت ریڈیو بجائے جانے پر اس قدر غصے میں آئے کہ ریڈیو کو اُٹھا کر پٹک دیا۔ وہ چکنا چور ہو کے رہ گیا۔ لیکن ہنگامی غیظ و غضب کے باوجود مزاج کے اعتبار سے ان کی زندگی کا موجودہ دور نرمی و ملائمت، ضبط و تحمل اور عفو و درگذر کا دور ہے۔

شادانی صاحب کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ اپنے شعر و ادب پر تنقید گوارا نہیں کرتے۔ میں نے انھیں تنقید گوارا کرتے ہی نہیں بلکہ عملی طور پر تسلیم کرتے بھی دیکھا ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق (ڈھاکا) کے جلسوں میں اعتراضات کی بنا پر اُنھوں نے اکثر اپنے مضامین میں حذف و اضافہ سے کام لیا ہے اور جب کبھی میں نے یا ارشد کاکوی نے ان کے کسی شعر یا شعر کے کسی ٹکڑے سے بے اطمینانی ظاہر کی ہے تو اُنھوں نے اکثر اس شعر میں ترمیم کر لی ہے۔ وہ اپنے شعر و ادب کے معاملے میں تو معترضین کی طرف سے اپنے کان بند رکھتے ہیں اور نہ خود اپنی آنکھیں۔ ایک دفعہ مجھ سے گفتگو کے دوران میں فرمایا کہ آج میں یہاں وہاں سے "نشاطِ رفتہ" دیکھ رہا تھا تو مجھے پہلی مرتبہ کئی خامیوں کا احساس ہوا۔ وہ خامیاں زیادہ تر ابتدائی کلام میں ہیں مگر ان خامیوں تک میرے نقادوں کی نظر نہ پہنچ سکی۔ وہ تو میرے بے عیب شعروں میں عیب ڈھونڈتے رہ گئے۔

شادانی صاحب نے میری خواہش پر اپنی کتابوں کا ایک سیٹ رسالہ "نگار" لکھنؤ کے پاس تبصرے کے لیے بھجوا دیا تھا۔ نیاز صاحب نے نہایت ناموافقانہ تبصرے لکھے جنھیں پڑھ کر شادانی صاحب کے ایک رفیقِ کار کو طیش آگیا اور اُنھوں نے کہا کہ میں ان تبصروں کا جواب لکھوں گا اور نیاز صاحب کو ایسا آڑے ہاتھوں لوں گا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ اس پر شادانی صاحب نے کہا بیکار ہے، ایک چیز یاد رکھیے، میرے ایک دوست تھے بلا کے ذہین لیکن علم کے لحاظ سے صفر۔ ان کا ایک جملہ میرے ذہن میں آج تک محفوظ ہے۔ جب کبھی میں کسی سے بگڑتا تو کہتا "اچھا دیکھیں گے ہمارے ہاتھ میں قلم ہے" اس پر

پر کہا کرتے "میاں اپنی تعمیر کی کوشش کرو، دوسروں کی تخریب سے کیا فائدہ"۔

اپنی تعریف و تحسین میں اپنے شاگردوں اور مداحوں سے مضامین لکھوانا ادیبوں اور شاعروں کی ایسی کمزوری ہے جس سے بہت کم ادیب اور شاعر مبرّا ہیں۔ میں ذاتی طور پر بعض ممتاز و مستند ادیبوں کی اس کمزوری سے واقف ہوں لیکن میں نے شادانی صاحب کی ذات میں اس کمزوری کا شائبہ تک نہ پایا۔ ان کے شاگردوں اور مداحوں میں اچھے سے اچھے لکھنے والے موجود ہیں۔ ان میں سے بعض اس بات کے آرزومند بھی تھے کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھ ڈالیں لیکن شادانی صاحب نے ان کے اس خیال کی ہمت افزائی کبھی نہیں کی۔ میں جو ان کا شاگرد ہونے کے باوجود ان سے ان پر کتاب لکھنے کی رضامندی حاصل کر سکا تو میرا دل ہی جانتا ہے کہ ان کی رضامندی کے باوجود[1] اس کتاب کے لیے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں مجھے ان کی طرف سے کتنے صبر آزما اور ہمت شکن بلکہ دل شکن مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ وہ کسی سے اپنے اوپر لکھنے کی تمنا کیا معنی، لکھنے میں تعاون تک نہیں کرتے۔ ایران سے کئی مرتبہ فرمائشیں آئیں کہ اپنے حالاتِ زندگی اور اپنی تصانیف کے نام بھیج دیجیے تاکہ فلاں کتاب میں شامل کیے جا سکیں۔ لیکن ایسے نیازمندوں کی طرف ان کا رویہ ہمیشہ بے نیازی کا رہا۔ ہندوستان اور پاکستان میں اردو شعر و ادب کے بعض مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے ان سے بارہا حالاتِ زندگی اور کلام بھیجنے کی درخواست کی لیکن جواب میں وہی خاموشی اور بے نیازی جو یقیناً کسی پندار کا نتیجہ نہیں بلکہ نام و نمود کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان کے پاس حالاتِ زندگی اور کلام سے متعلق جو فرمائشیں آئیں ان میں سے بعض کی تعمیل خود میں نے کی ہے۔

---

[1] میرا ارادہ ان پر ایک کتاب لکھنے کا تھا۔ میں نے کئی ابواب مکمل بھی کر لیے تھے۔ یہ مضمون اسی کتاب کا ایک باب ہے لیکن بوجوہ اب یہ کتاب کبھی شائع نہ ہو گی (ن۔ ص)

شادانی صاحب کی ذات اور زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر وہ فخر کر سکتے ہیں اور بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ وہ ذہین آدمی ہیں۔ منفرد شاعر ہیں۔ ممتاز محقق ہیں۔ اپنے رنگ کے واحد افسانہ نگار ہیں۔ اردو اور فارسی زبان وادب کے پروفیسر ہیں۔ انگریزی بولنے اور لکھنے پر قادر ہیں۔ تحریر و تقریر دونوں کے دھنی ہیں۔ بعض قابلِ فخر استادوں کے شاگرد اور بہت سی مشہور و ممتاز شخصیتوں کے استاد رہ چکے ہیں۔ ہندوستان و پاکستان میں علم وادب کے جتنے مشاہیر ہیں وہ سب کے سب شادانی صاحب کو محترم گردانتے ہیں۔ علمی مباحث اور ادبی مسائل میں ان کی رائیں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس وقت تک کئی یونیورسٹیوں کی طرف سے کتنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالوں کے ممتحن رہ چکے ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کی متعدد یونیورسٹیوں اور کانفرنسوں میں ڈھاکا یونیورسٹی کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ ثقافتی وفد کے رکن کی حیثیت سے جب بھی ایران گئے تو وہاں ارباب علم وادب سے لے کر ارکانِ حکومت تک ان کی زباندانی اور بدیہہ گوئی سے محظوظ و متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن شادانی صاحب ان میں سے کسی بات پر فخر کرنا تو ایک طرف ان کا ذکر تک نہیں کرتے۔ ضمناً ذکر آ گیا تو آ گیا ورنہ وہ اپنی کارکردگی اور اپنے کارناموں کو اپنی گفتگو کا موضوع ہرگز نہیں بناتے۔ البتہ بعض اوقات کسی مسئلے کے متعلق اظہار خیال کرتے وقت یا اپنا کوئی تازہ شعر سناتے وقت تمہید کے طور پر اتنا ضرور کہتے ہیں کہ اس معاملے کا ایک پہلو ایسا ہے جو غالباً اب تک کسی کے ذہن میں نہیں آیا یا نہیں آیا ہوگا یا یہ کہ اس شعر میں جو خیال ادا کیا گیا ہے وہ شاید ہی کسی اور کے یہاں ملے۔ میرے ان کے درمیان جب ایسے مواقع آئے ہیں تو میں نے بعض اوقات ان کی تمہید سے اختلاف کی جرأت کی ہے لیکن انھوں نے کبھی میری اس جرأت کا برا نہیں مانا بلکہ بڑی خوش دلی کے ساتھ میرے خیال سے متفق ہو گئے۔

شعر گوئی کا تجربہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ شاعر کے ذہن میں کبھی ڈھلا

ڈھلایا شعر آجاتا ہے اور کبھی صرف شاعرانہ خیال جسے شاعر کی ذہنی کاوشیں شعر کی شکل عطا کرنے میں کبھی کامیاب ہو جاتی ہیں اور کبھی ناکام رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ شادانی صاحب کے ذہن میں کوئی خوبصورت خیال آنکلا جو بعد میں کبھی شعر بنا اور کبھی نہ بن سکا۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے مجھے اپنے ایک شعر کا نفسِ مضمون سنایا جو ابھی نہیں کہا گیا تھا بلکہ جو آج تک نہیں کہا گیا۔ نفسِ مضمون یہ تھا کہ انسان کو محبت میں مجبوریوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن دوسری چیزوں کو نہیں مثلاً چاند اور چکور، شمع اور پروانہ ان کی محبت میں کوئی مزاحم نہیں ہوتا۔ شادانی صاحب نے یہ نفسِ مضمون اسی تمہید کے ساتھ سنایا جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔ میں نے کہا خیال خوبصورت تو ضرور ہے لیکن نادر ہرگز نہیں۔ اس پر اُنھوں نے مجھ سے مثال چاہی۔ میں نے جواب میں سیماب اکبر آبادی کا یہ شعر پڑھ دیا ؎

بھڑک اُٹھی ہے کیوں دُنیا مری ان کی محبت پر
یہ شورش کیوں خلافِ شمع و پروانہ نہیں اُٹھی

شعر سُن کر فرمایا۔ ہاں خیال تو وہی ہے مگر پیرایۂ بیان خوبصورت نہیں لفظ بھڑکنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اسی طرح ایک دن اُنھوں نے اپنا یہ شعر سنایا ؎

ہوا یہ ہم کو نیا تجربہ محبت میں
کہ دل ہی اب نہیں لگتا کسی کی صحبت میں

اور کہا کہ اگرچہ بات سامنے کی ہے مگر اب تک کہی نہیں گئی۔ میں نے کہا جرأت کا یہ مصرع آپ کے شعر سے بہت قریب ہے جی کہیں لگتا نہیں جب دل کہیں لگ جائے ہے۔ کہنے لگے ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ جرأت نے تو بالکل وہی بات کہہ دی۔

ڈھاکے کے نوخیز ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی تہذیب و تربیت میں
یہاں کی ادبی انجمن حلقۂ ارباب ذوق کو اور حلقۂ ارباب ذوق کی افادیت اور راہمیت
میں شادانی صاحب کے تعاون کو بڑا دخل رہا ہے۔ حلقے کا طریق کار یہ ہے کہ اس
کے ہفتہ وار جلسے میں دو چیزیں پڑھی جاتی ہیں ایک نثر میں دوسری نظم میں اور ان
پر حاضرین کی طرف سے بڑی آزادی کے ساتھ اظہارِ خیال ہوتا ہے۔ اس بے لاگ
بحث و تمحیص میں استادوں اور بزرگوں کے ساتھ بھی کسی قسم کی رو رعایت نہیں
کی جاتی۔ چنانچہ حلقے کا یہ طریق کار بزرگوں کے لیے بڑی حد تک ناقابلِ برداشت
ثابت ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شادانی صاحب کے سوا باقی تمام بزرگانِ ادب
بہت جلد حلقے سے کنارہ کش ہو گئے لیکن شادانی صاحب شروع سے لے کر
اب تک حلقے سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کی تحریروں کے ساتھ بھی حلقے والے
وہی سلوک کرتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے لیکن انھوں نے کبھی
اس کا برا نہیں مانا بلکہ بسا اوقات وہ حلقے میں کچھ پڑھتے وقت اس بات کی تاکید
کرتے سنے گئے کہ ان کے مضمون یا نظم پر تنقید کرنے میں پاسِ خاطر سے ذرا بھی کام
نہ لیا جائے۔ شادانی صاحب اپنی تحریروں پر حلقے والوں کی الٹی سیدھی تنقید صرف
سننے اور سہنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ جب کبھی اور جہاں کہیں اپنے آپ کو معترضین
سے متفق پاتے ہیں وہاں اپنی تحریروں میں رد و بدل بھی کر لیتے ہیں یہ اور بات کہ
انھیں اس بات کی ضرورت شاذ و نادر ہی پیش آتی ہے۔ ان کا قول ہے کہ کوئی شخص
خواہ اس کا علم کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو اعتراضات سے بالاتر نہیں ہوتا۔ سیکھنے
کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ یہ خیال اور اس قسم کا خیال شادانی صاحب کی عالی
دماغی، بلند ظرفی اور وسیع النظری پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن حلقے کو ان کی ذات سے
صرف ان کی عالی دماغی، بلند ظرفی اور وسیع النظری کا ثبوت نہیں ملا ہے بلکہ مستقل
فائدے بھی پہنچے ہیں۔ حلقہ ان کے بغیر جسد بے روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ حلقے کے
جلسوں میں شادانی صاحب کئی طرح کے فرائض انجام دیتے ہیں مثلاً اگر کسی مسئلے پر

دو حضرات آمادۂ جنگ ہیں تو اس جنگ کی روک تھام شادانی صاحب کریں گے ۔ اگر کسی مضمون یا نظم کے ساتھ اربابِ حلقہ ناانصافی کر رہے ہیں تو اس ناانصافی کی تلافی شادانی صاحب کریں گے ۔ اگر کسی اچھے شعر کو غلط نقطۂ نظر سے برا شعر ثابت کیا جا رہا ہے تو اس غلط نقطۂ نظر کی تصحیح شادانی صاحب کریں گے ۔ اگر کسی بُرے شعر کو بُرا کہنے کی صحیح وجہ نہیں بتائی جا رہی ہے تو وہ صحیح وجہ شادانی صاحب فراہم کریں گے ۔ اگر کسی مضمون کے متعلق بہت کچھ کہنے کے باوجود بعض اہم پہلوؤں کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو ان اہم پہلوؤں کی طرف شادانی صاحب توجہ دلائیں گے ۔ اگر بحث کے دوران زبان و بیان کا کوئی پیچیدہ مسئلہ پیدا ہو جائے تو اس کا حل شادانی صاحب پر منحصر ہوگا ۔ اگر عروض وقافیہ اور قواعد سے متعلق کوئی اعتراض کیا گیا ہے تو اس کی صحت یا عدم صحت کی تصدیق شادانی صاحب سے طلب کی جائے گی ۔ اگر کوئی صاحب اپنے مافی الضمیر کو اُلجھے ہوئے انداز میں بیان کر کے حاضرین کو اُلجھا رہے ہیں تو ان کی گفتگو کے ماحصل کو سلجھے ہوئے انداز میں شادانی صاحب بیان کریں گے ۔ اگر دو صاحب کسی فن پارے کی خوبی یا خامی کے بارے میں بالکل متضاد باتیں کہہ رہے ہیں تو دونوں کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے دونوں کو درمیانی راہ اختیار کرنے کی ترغیب دینا شادانی صاحب کا کام ہوگا ۔ غرض کہ حلقے میں ہر نازک موقع پر شادانی صاحب آڑے آتے ہیں ۔ ان کی وجہ سے حلقے کی جنگ صلح میں اور تلخی شیرینی میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔

شادانی صاحب صحیح زبان لکھنے اور بولنے کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ اس پر اس حد تک قادر بھی کہ زبان و بیان کے معاملے میں ان کی تحریر و تقریر سند کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ زبان اور محاورے کی تحقیق ان کا محبوب مشغلہ رہی ہے ، لیکن زبان ، محاورے اور تلفظ کے معاملے میں حد درجہ محتاط ہونے کے باوجود وہ تند مزاج بالکل نہیں ۔ کسی کی زبان یا تلفظ میں بڑی سے بڑی غلطی دیکھ کر انھیں ذہنی کوفت

جس قدر بھی ہوتی ہو لیکن اس کا اظہار الفاظ یا اشارے میں کبھی نہیں ہونے دیتے۔ میں نے اُنھیں غلط زبان بولنے والوں پر کبھی مسکراتے یا پیٹھ پیچھے تمسخراً مذاق اُڑاتے بھی نہیں دیکھا۔ ان کا یہ ضبط و ظرف اس لحاظ سے حیرت انگیز ہے کہ عموماً زبان کی غلطیوں کو وہ لوگ بھی معاف نہیں کرتے جو خود صحیح زبان بولنے پر پوری قدرت نہیں رکھتے۔

شادانی صاحب کا ذاتی کتب خانہ کتابوں کے باب میں ان کے ذوق اور سلیقے دونوں کا آئینہ دار ہے۔ علم و ادب کے معاملے میں وہ زندوں سے زیادہ مردوں سے دل چسپی رکھتے ہیں اسی لیے ان کے کتب خانے میں "قدیم" کا عنصر "جدید" سے زیادہ ہے۔ ان قدیم کتابوں میں اردو اور فارسی کے بعض بڑے نایاب نسخے بھی ہیں۔ شادانی صاحب ہمیشہ علمی نوادر کی ٹوہ میں رہا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں کباڑیوں کی دکانوں کا پھیرا ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ کباڑیوں سے سودا چکانے میں بڑی سیاست سے کام لیتے ہیں۔ جو کتابیں جتنی نادر اور نایاب ہوتی ہیں اُنھیں بظاہر اتنی ہی بے دلی اور بے اعتنائی سے دیکھ کر رکھ دیتے ہیں تاکہ کباڑیے کو پتا نہ لگنے پائے کہ ان کتابوں کا کوئی قدردان آنکلا ہے، پھر دو چار فالتو کتابیں چن کر کباڑیے سے دام پوچھتے ہیں۔ وہ دام بتانے سے پہلے ان نادر اور نایاب کتابوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہیے تو اُنھیں بھی دے دوں۔ اس پر شادانی صاحب کچھ اس طرح منہ بنا کر رضامندی کا اظہار کرتے ہیں جیسے مجھے ان کتابوں سے کیا لینا لیکن تم کہتے ہو تو خیر اُنھیں بھی لے لیتا ہوں۔ اس طرح شادانی صاحب کو بہت سی نادر و نایاب کتابیں بہت ہی سستے داموں ہاتھ لگ گئی ہیں۔ ان کے کتب خانے میں تھوڑی سی انگریزی کتابیں بھی ہیں۔ لیکن سچ پوچھیے تو ان کا کتب خانہ عبارت ہے اردو اور فارسی کتابوں سے۔ ان کی دلچسپی اردو اور فارسی ادبیات پر ہی مرکوز رہی ہے۔ ان کے یہاں اردو اور فارسی کی کلاسیکل کتابوں کے علاوہ لغات کا بڑا اچھا ذخیرہ ہے۔ اگر آپ

۔ ان کے گھر پر کسی لفظ یا محاورے کے متعلق ان سے کوئی استفسار کریں تو پہلے وہ کوئی مختصر سا جواب دے دیں گے۔ اس کے بعد اُٹھ کر بیسیوں مرتبہ اپنے کمرے میں جائیں گے اور آپ کے سامنے لغات کا انبار لگا دیں گے۔ جب تک وہ زیر بحث لفظ یا محاورے کو مختلف لغات میں نہ دیکھ لیں گے اور آپ کو نہ دکھا دیں گے اس وقت تک انھیں تشفی نہ ہوگی چاہے آپ کی تشفی ان کے مختصر جواب ہی سے کیوں نہ ہو گئی ہو۔ اس باب میں بعض اوقات میں نے ان کی سرگرمی کو اپنے اور دوسروں کے لیے صبر آزما بھی پایا ہے۔

شادانی صاحب کو رسالوں سے کوئی خاص دل چسپی نہیں۔ ان کے پاس بہت سے رسالے اعزازی طور پر آتے رہتے ہیں۔ جو نہیں آتے اُنھیں منگاتے بھی نہیں۔ وہ رسالوں کو سرسری طور پر یہاں وہاں سے دیکھ لیتے ہیں۔ ان کے یہاں پرچے محفوظ بھی نہیں رہتے لیکن محفوظ نہ رہنے کی ساری ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ ان کے یہاں کتابیں ضرور محفوظ رہتی ہیں کیونکہ وہ الماریوں میں رکھی جاتی ہیں اور الماریاں مقفل رہا کرتی ہیں۔ شادانی صاحب کتاب مانگنے والوں کو مایوس نہیں کرتے یا نہیں کر پاتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھیں اپنی بعض قیمتی اور نایاب کتابوں سے ہاتھ دھو لینا پڑا ہے لیکن اس کے باوجود استفادہ کرنے والوں پر ان کے کتب خانے کا دروازہ کبھی بند نہیں رہا۔

شادانی صاحب کا مطالعہ وسیع بھی ہے اور محدود بھی۔ اردو اور فارسی کے ادب العالیہ، لغت، قواعد اور عروض وغیرہ پر وہ عالمانہ عبور اور محققانہ نظر رکھتے ہیں لیکن دُنیا کے ادب العالیہ سے ان کی واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ خود اردو کے موجودہ ادب سے بھی کچھ زیادہ واقف نہیں۔ انگریزی، فرانسیسی روسی، جرمنی، امریکی ادیبوں اور شاعروں میں سے اُنھوں نے کسی ایک کا بھی مکمل مطالعہ نہیں کیا ہے۔ وہ یورپ اور امریکہ کے ادب کی نئی تحریکوں، شاعری کے نئے تجربوں تنقید کے نئے اسکولوں، افسانے، ڈرامے اور ناول کی نئی تکنیکوں اور فکر و فن کے

نئے مسائل سے بڑی حد تک بے خبر ہیں۔ ان میں سے جتنی چیزیں موجودہ اردو ادب میں آ چکی ہیں وہ ان سے بھی پوری طرح آگاہ نہیں۔ فلسفہ، نفسیات، عمرانیات اور مذہبیات جن کا موجودہ دور کے ادبیات سے بڑا گہرا تعلق ہے ان کی توجہ کو جذب نہ کر سکے لیکن ان تمام کوتاہیوں کے باوجود وہ ہر جگہ اپنے وزن و وقار کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں بلکہ بسا اوقات ان لوگوں سے زیادہ کامیاب رہے ہیں جن کا مطالعہ ان سے بدرجہا زیادہ وسیع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ ان کا اکتسابی علم بہت محدود ہے لیکن ان میں فطری بصیرت ہرگز مفقود نہیں۔ قدرت نے اُنھیں دُور رس ذہن اور نکتہ رس طبیعت ودیعت کی ہے، پھر یہ کہ وہ ذاتی غور و فکر سے جن نتائج تک پہنچتے ہیں اُنھیں اس قدر خود اعتمادی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ سُننے والا ان کے خیالات سے متفق نہ ہونے کے باوجود ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

مطالعہ اسی وقت مفید ثابت ہوتا ہے جب مطالعہ کرنے والے میں اخذ و استفادہ کا سلیقہ موجود ہو۔ شادانی صاحب کو مطالعے کا بے پایاں شوق نہ سہی لیکن مطالعے سے اخذ و استفادہ کا جیسا سلیقہ اُنھیں آتا ہے ویسا دوسروں میں کم پایا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے دورانِ سفر میں عزیز احمد کا ناول "شبنم" پڑھا جس کا مرکزی خیال ان کے نزدیک یہ ہے کہ جس طرح محبت مستقل وصال میں زندہ نہیں رہتی اسی طرح مسلسل فراق میں بھی زندہ نہیں رہتی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وصال میں محبت جلد فنا ہو جاتی ہے اور فراق میں اس کا خاتمہ بتدریج ہوتا ہے۔ اس خیال کو اُنھوں نے اپنے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے

وصال مرگِ محبت ہے اور فراق میں بھی
سسک سسک کے محبت کا دم نکلتا ہے

اسی طرح ایک مرتبہ اُنھوں نے ایک جدید فرانسیسی ماہر نفسیات آندرے ترے دُوں کی مختصر مگر قابل قدر کتاب (PSYCHO-ANALYSIS AND LOVE) میں پڑھا کہ بھوک کی مانند محبت انسان کی بالکل غیر ارادی خواہش ہے۔ ہم کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں لیکن اپنے آپ کو محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ بالارادہ کسی سے محبت کر سکیں۔ کسی کو چاہنے اور نہ چاہنے میں انسان کے اختیار اور ارادے کو مطلق دخل نہیں۔ آندرے ترے دوں کے اس نظریے سے شادانی صاحب نے جو نتیجہ اخذ کیا اس نے اس بے مثال شعر کی شکل اختیار کی ؎

دل جدھر جھکا، جھکا اور جہاں رکا، رکا
کوئی بے وفا نہیں، کوئی باوفا نہیں

ایک مرتبہ ایک انگریزی افسانہ ان کی نظر سے گزرا جس میں مصنف نے یہ دکھایا تھا کہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ناجائز تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں جن کی ذمہ داری ایسے حالات پر ہے جن میں کوئی بھی مرد یا عورت اس لغزش سے بچ نہیں سکتی۔ دونوں کے تعلقات کا نتیجہ ایک بچے کی پیدائش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ سماج ان دونوں کو نہایت حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اُنھیں سزا دینے کے درپے ہے۔ اس پر وہ دونوں صرف اس بات کی خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ ہمیں جو سزا چاہو دے لو لیکن پہلے ہماری روداد تو سن لو تاکہ تمھیں ہمارے گناہ کی مقدار (MAGNI TUDE) کا صحیح اندازہ ہو جائے۔ اس افسانے نے شادانی صاحب کے ذہن پر جو تاثر چھوڑا وہ اس بے پناہ شعر کی تخلیق کا باعث ہوا ہے ؎

گناہ کا اپنے معترف ہوں یہ التجا ہے کہ پاکباز و
کرو مجھے سنگسار لیکن گناہ کی داستاں تو سن لو

شادانی صاحب کے مطالعے کے ان نتائج کو دیکھ کر مجھے بارہا خیال آیا کہ اگر انھیں دُنیا کے ادب العالیہ سے گہری دلچسپی ہوتی تو اردو ادب اور اردو شاعری کو ان سے بڑا فائدہ پہنچتا۔ جو لوگ یورپ اور امریکہ کے ادب سے مستفید ہو کر اردو ادب کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں مجھے ان کی ذہانت اور صلاحیت سے انکار نہیں لیکن بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے وہ لوگ کچے مال کا کاروبار کر رہے ہیں۔

شادانی صاحب کے یہاں عام روش سے ہٹ کر چلنے، مروجہ طریقے سے بچ کر سوچنے اور اپنے موضوع پر غیر متوقع سمت سے حملہ کرنے کا جذبہ نمایاں ہے۔ اس جذبے کے زیر اثر بعض اوقات وہ ایسا طریق کار اختیار کرتے ہیں جو نہ صرف نیا ہوتا ہے بلکہ حیرت انگیز طور پر دلچسپ بھی۔ مثلاً ایک مرتبہ اُنھوں نے "مخزن فوائد" از نکہت دہلوی کے متعلق ایک تحقیقی مضمون لکھا جس میں منجملہ اور باتوں کے یہ بتایا کہ اس لغت میں فلاں فلاں زبان کے اتنے الفاظ ہیں۔ اس بات پر قاضی عبدالودود جیسا محقق حیران کہ آخر شادانی صاحب کو یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی کیونکہ کسی کتاب یا تذکرے میں اس کا ذکر نہیں۔ ان کے استفسار پر شادانی صاحب نے لکھ بھیجا کہ یہ بات کسی کتاب یا تذکرے سے نہیں بلکہ خود الفاظ کو گن لینے سے معلوم ہو گئی۔

ایک مرتبہ میں نے اُنھیں مسلسل کئی دن تک فرہنگ آصفیہ کی ورق گردانی کرتے ہوئے پایا۔ ایک دن پوچھ بیٹھا کہ کیا دیکھ رہے ہیں تو مسکرا کے فرمایا جب دیکھتا ہوں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ لغت دیکھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ ہماری اردو زبان میں کتنی وسعت ہے مثال کے طور پر اُنھوں نے ایک محاورہ (سواری

کھانا جس کے معنی ہیں تفریحاً سواری کرنا) اور اس کے معنی بیان کیے۔ میں یہ جواب سن کر اور یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ شادانی صاحب کو زبان اور محاورے کی چھان بین کا جنون شروع سے ہے۔ اسی لیے ان کے فرہنگ آصفیہ دیکھنے پر زیادہ متجسس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسی زمانے میں شادانی صاحب کلیات انشا کا بھی مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے اس کا مقصد دریافت نہیں کیا۔ لیکن کئی روز بعد یہ بات کھلی کہ فرہنگ آصفیہ اور کلیات انشا کا مطالعہ ایک خاص سلسلے میں کیا جا رہا تھا۔ اس زمانے میں فراق کے متعلق میرا ایک مضمون "نگار" (لکھنؤ) میں شائع ہوا تھا جس میں ایک جگہ یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ اردو کی عشقیہ شاعری ہندو کلچر سے بڑی حد تک بے نیاز رہی۔ شادانی صاحب کو میری اس رائے سے اختلاف تھا اور وہ اس کی تردید میں مضمون لکھنا چاہتے تھے چنانچہ مواد کے لیے کئی لکھنوی شعرا کے دواوین کے علاوہ فرہنگ آصفیہ کی جلدوں کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کر گئے تاکہ انھیں ہندو کلچر سے متعلق اردو زبان کے الفاظ و محاورات اور ان کے ذریعے ہندوانہ رسم و رواج کا علم ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ شادانی صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ مذکورہ بالا موضوع پر اور جتنی بھی کتابیں دیکھتا لیکن فرہنگ آصفیہ سے ہرگز رجوع نہ کرتا۔ یہاں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ اس موضوع پر شادانی صاحب نے محنت تو بہت کی لیکن مضمون نہیں لکھا۔

اسی زمانے میں شادانی صاحب کو شیفتہ کی تنقید نگاری پر بھی لکھنے کی تحریک ہوئی۔ اردو شعرا کے تذکروں میں شیفتہ کے تذکرۂ "گلشن بیخار" کو تنقیدی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت دی گئی ہے اور شیفتہ کے متعلق بڑے نقاد ہونے کا دعویٰ کیا جاتا رہا ہے۔ شادانی صاحب نہ تو "گلشن بیخار" کی انتقادی اہمیت کے قائل ہیں اور نہ شیفتہ کی انتقادی صلاحیت کے۔ انھوں نے شیفتہ اور "گلشن بیخار" کے بارے میں اردو نقادوں کے دعووں کو غلط ثابت کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ انھیں کا حصہ تھا اور بس۔ شادانی صاحب نے دیکھا کہ شیفتہ

کی انتقادی صلاحیت اور اہمیت سے متعلق سارے دعوے بڑی حد تک غالب کے ان دو ایک شعروں پر مبنی ہیں جو شیفتہ کی سخن فہمی کی تعریف میں کہے گئے تھے چنانچہ اُنھوں نے اپنے مقالے میں سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ غالب نے اپنے معاصرین کی تعریف میں جو کچھ کہا اور لکھا ہے وہ تنقیدی نقطۂ نظر سے ذرا بھی قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ اس متعلق سارے دعوے بڑی حد تک غالب کے ان دو ایک شعروں پر مبنی ہیں جو شیفتہ کی سخن فہمی کی تعریف میں کہے گئے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے مقالے میں سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ غالب نے اپنے معاصرین کی تعریف میں جو کچھ کہا اور لکھا ہے وہ تنقیدی نقطۂ نظر سے ذرا بھی قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے غالب کی نثر و نظم کے ہزاروں صفحات پڑھ کر غالب کی تعریفوں کے حد درجہ مبالغہ آمیز اور ذاتی غرض پر مبنی ہونے کی اتنی مثالیں بہم پہنچائی ہیں کہ ان کی موجودگی میں شادانی صاحب کی رائے سے اختلاف کرنا ممکن ہی نہیں۔ شیفتہ کے متعلق اردو نقادوں کا دعویٰ یہ بھی رہا ہے کہ اُنھوں نے "گلشن بیخار" میں ہر شاعر کے متعلق اپنی رائے لکھی ہے۔ شادانی صاحب نے گن کر بتایا کہ شیفتہ نے ۶۷۶ میں سے صرف ۶۰ شاعروں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور یہ رائے بھی بڑی حد تک اگلے تذکرہ نویسوں سے ماخوذ ہے۔

غالب نے انشائے ابوالفضل کے متعلق بڑی پست رائے کا اظہار کیا ہے حالانکہ غالب کا طرزِ انشا بڑی حد تک ابوالفضل ہی کا رہینِ منت ہے۔ شادانی صاحب نے غالب کے فارسی اسلوب پر ابوالفضل کے اثرات دریافت کرنے میں پانچ سال تک محنت کی جس کا ماحصل یہ ہے کہ غالب کے مخصوص الفاظ، فقرے اور ترکیبیں وغیرہ ابوالفضل کی دین ہیں۔ اس باب میں اُنھوں نے جس عرق ریزی اور جگر کاوی سے مواد فراہم کیا ہے وہ حد درجہ حیرت انگیز ہے۔ لیکن افسوس[1] کہ اس مواد نے ابھی تک مضمون کی شکل اختیار نہیں کی۔

---

[1] اب یہ مضمون صحیفہ لاہور کے غالب نمبر حصہ اول میں آگیا ہے (ن۔ص)

میں نے فراقؔ کی کتاب" اردو کی عشقیہ شاعری" شادانی صاحب سے لے کر پڑھی تھی۔ اس میں سرورق کے بعد والے صفحے پر شادانی صاحب نے پنسل سے لکھ چھوڑا ہے کہ اس کتاب کے کن صفحات میں کن شعرا کے کتنے حوالے دیئے گئے ہیں اور ان شاعروں کے نقل کردہ اشعار کی مجموعی تعداد کیا ہے۔ اسی حساب کتاب کی بنا پر شادانی صاحب فراقؔ کے بارے میں بڑے اعتماد سے کہا کرتے ہیں کہ وہ اپنے مضامین میں اپنی شاعری کا پروپیگنڈا خوب کرتے ہیں۔ یہ بات اور لوگ بھی کہا کرتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اتنی سی بات کے لیے دوسروں نے وہ زحمت گوارا نہ کی ہوگی جو شادانی صاحب نے اپنے لیے روا رکھی۔

شادانی صاحب بڑے ذہین آدمی ہیں لیکن انھوں نے اپنی ذہانت کو ریاضت کا بدل کبھی نہیں بننے دیا۔ جو کام جس قدر محنت چاہتا ہے اس پر وہ اتنی محنت ضرور صرف کرتے ہیں۔ جب کچھ لکھنا شروع کرتے ہیں تو دن کو دن سمجھتے ہیں نہ رات کو رات۔ فرصت کا ہر لمحہ اپنے موضوع سے متعلق کتابوں اور مقالوں کو پڑھنے، ان پر غور کرنے اور مضمون لکھنے کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ وہ کسی کام کو بیدلی سے جوں توں ختم کر کے رکھ دینے کے قائل نہیں۔ میں نے بعض اوقات انھیں بعض اَن پڑھ آدمیوں کے پاسپورٹ اور ویزا کا فارم بھرتے دیکھا ہے اور اس صبر و سکون اور احتیاط و انہماک کے ساتھ جیسے یہ ناخوشگوار کام کسی غیر کا نہیں اپنا ہی ہے۔

جلدی بازی اگر موجودہ زمانے کا مرض ہے تو شادانی صاحب موجودہ دور میں رہنے کے باوجود اس مرض سے ہمیشہ محفوظ رہے ہیں۔ کوئی موقع ہو، کوئی بات ہو، کوئی کام ہو میں نے کبھی انھیں عجلت سے کام لیتے ہوتے نہیں پایا۔ ان کاموں کی بات اور ہے جن کے لیے انھیں وقت بہت کم دیا گیا ہو یا مصروفیتوں کے باعث ان کے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہو اور اس میں بھی کام کا سرانجام ناگزیر ہو۔ عام طور پر وہ ہر کام خواہ معمولی ہو یا غیر معمولی اتنے اطمینان اور انہماک سے کرتے ہیں

جیسے اسی کام کے لیے دُنیا میں آتے ہیں اور اس کی تکمیل سے پہلے واپس جانے کا نہ امکان ہے نہ ارادہ۔ اس باب میں ان کی افتادِ طبیعت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض اوقات وہ کسی کام میں آتنی چھان بین اور اتنا اہتمام کرنے کی نیت باندھ لیتے ہیں کہ کام شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔

شادانی صاحب قلم برداشتہ لکھنے کے عادی نہیں۔ ان کے مسودے میں کاٹ چھانٹ بہت ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی وقت کی تنگی کے باعث ریڈیو کی تقریر اس طرح لکھتے ہیں کہ اسے صاف کرنے کی ضرورت نہ پڑے اور مسودہ جوں کا توں ریڈیو آفس بھیج دیا جا سکے۔ لیکن ان کے ادبی مضامین کے مسودے ایڈیٹروں کے پاس بھیجنے کے لائق نہیں ہوتے۔ بسا اوقات اپنے مضمون کی نقل آپ کرتے ہیں۔ میں نے اُنھیں بارہا نجی خطوط کا بھی مسودہ کرتے دیکھا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایسے خطوط کا مکتوب الیہ کوئی بڑا ادیب یا شاعر ہو۔ عموماً جب وہ کسی کو طویل خط لکھتے تو خواہ اس خط کا مکتوب الیہ کوئی کم سواد پبلشر ہی کیوں نہ ہو پہلے اس کا مسودہ کر لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ طلبہ کو سرٹیفکیٹ دیتے وقت پہلے اسے معمولی کاغذ پر شکستہ خط میں لکھ لیتے ہیں پھر اپنے شعبے کے پیڈ پر اسے نقل کر کے یا ٹائپ کر کے طالب علم کے حوالے کرتے ہیں۔

شادانی صاحب نہایت خوش خط واقع ہوئے ہیں۔ ان کا شکستہ خط (گھسیٹ) بھی صفائی اور حسن سے خالی نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ ان کے دوست ذوالفقار علی بخاری (سابق ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) نے ان کے حسنِ خط کی داد دیتے ہوئے لکھا تھا "کوئی دو منٹ ہوئے تمھارا خط ملا۔ کیا معشوقانہ خط پایا ہے تم نے"۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے، شادانی صاحب اور شاداں بلگرامی کے خط میں مشابہت پائی تھی۔ شادانی صاحب کو اپنے اور میرے خط میں مشابہت نظر آئی۔ ایک دن کہنے لگے میرے تمھارے خط میں بڑی مشابہت ہے۔ اگر میرے تمھارے خط کے نمونے ایک ساتھ رکھ دیئے جائیں تو بادی النظر میں شاید ہی کوئی

ان کے فرق کو محسوس کر سکے۔ شادانی صاحب کی اس دریافت سے پہلے میرا ذہن اس مشابہت کی طرف منتقل نہیں ہوا تھا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ ان کا خط میرے خط سے بہتر ہوتا ہے۔ یہ اعتراف از راہ انکسار نہیں بلکہ بربنائے حقیقت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شادانی صاحب کے ایک مکتوب الیہ کو میرے خط پر شادانی صاحب کے خط کا دھوکا ہو چکا ہے۔ کئی سال پہلے شادانی صاحب کی آنکھ میں کچھ تکلیف پیدا ہو گئی تھی جو ایک عرصے تک رہی جس کی وجہ سے وہ نہ لکھ سکتے تھے نہ پڑھ سکتے تھے۔ اس زمانے میں اُنھوں نے مختلف لوگوں کے نام بہت سے خطوط مجھ سے لکھوائے۔ ایک دن اپنے ایک عزیز کے نام پوسٹ کارڈ لکھوا کر بھیجا۔ اس سے پہلے کسی اور سے خط لکھوا کر بھیج چکے تھے جس میں آنکھ کی تکلیف کے باعث خود خط لکھنے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ ان کے عزیز نے میرے ہاتھ کا لکھا ہوا خط پڑھ کر جواب میں لکھا کہ "آپ (شادانی صاحب) کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ خُدا کرے آپ کی آنکھ کی تکلیف بالکل رفع ہو چکی ہو۔" مجھے شادانی صاحب کے عزیز کی خوشی دیکھ کر ان کی آنکھ کی صحت کے بارے میں شُبہ پیدا ہو گیا۔

شادانی صاحب کا حافظہ کسی زمانے میں بہت مضبوط تھا۔ اب اُس مضبوطی کے آثار تو رہ گئے ہیں لیکن مضبوطی باقی نہیں رہی۔ یعنی اُنھیں جو کچھ یاد تھا اُس میں سے بہت کچھ اب بھی یاد ہے لیکن اب جو کچھ وہ یاد رکھنا چاہتے ہیں اُنھیں یاد نہیں رہتا۔ لطائف اور اشعار اُنھیں آج بھی بہت یاد ہیں اور برمحل لطیفہ سنانے یا شعر پڑھ دینے کا ایسا ملکہ ہے کہ سُننے والے حیران رہ جاتے ہیں اور اپنے دلوں میں اُنھیں غیر معمولی حافظے کا آدمی سمجھ بیٹھتے ہیں لیکن دوسری طرف ان کی یادداشت کا عالم یہ ہے کہ روزمرہ زندگی میں وہ کئی ضروری کام خواہ اپنے ہوں یا دوسروں کے بھول جانے کے باعث نہیں کر پاتے۔ اپنی موجودہ ملازمت یعنی لکچرر ہونے سے پہلے میں کچھ عرصے تک کیشیر کی حیثیت سے بھی ملازمت کر چکا ہوں۔ یہ ملازمت

میرے لیے کس درجہ ناقابل برداشت تھی اس کا اندازہ اس بات سے کر لیجیے کہ میری زندگی کا ایک ڈیڑھ مہینہ جو اس ملازمت میں گزرا اسے میں آج تک اپنی زندگی میں شمار نہیں کر سکا ہوں۔ چنانچہ قدرتی طور پر میری خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اپنے آپ کو اس جانگسل ملازمت یا روح فرسا مصیبت سے نجات دلاؤں۔
اتفاق سے اس زمانے میں ایک مقامی کالج میں اردو لکچرر کی جگہ خالی تھی اور کالج کی مالی حالت کی بنا پر کچھ عرصے تک خالی رہنے والی تھی۔ میں نے شادانی صاحب سے کہا کہ کالج کے پرنسپل سے میری پیشگی سفارش کر دیجیے تاکہ جب تقرر کا وقت آئے تو میرا ہی تقرر ہو۔ اُنھوں نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ آفس (ڈین آفس) جا کر پرنسپل سے فون (اس وقت تک شادانی صاحب کے گھر پر ٹیلیفون نہ تھا) پر بات کر لوں گا۔ لیکن ایک عرصے تک میری سفارش کرنا بھولتے رہے۔ جب میں شام کو ان کے یہاں یہ معلوم کرنے کے لیے جاتا کہ میری سفارش کی گئی یا نہیں تو کہتے "لو آج میں بھول گیا۔ اچھا کل ضرور کہہ دوں گا۔" آخر کار میں نے سفارش کے لیے یاددہانی ترک کر دی اور تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ رہا۔ تقریباً ایک مہینے کے بعد شادانی صاحب نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ آج اس کالج کے پرنسپل مجھ سے ملنے آئے تھے میں نے تمھاری سفارش کر دی ہے۔ اُنھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وقت آنے پر تمھیں لے لیں گے۔ شادانی صاحب کی سفارش رائگاں نہ گئی اور پرنسپل صاحب کا وعدہ شرمندۂ ایفا ہو کر رہا۔

اگر بھولنا ایک بدسلوکی ہے تو یہ بدسلوکی وہ صرف دوسروں سے نہیں اپنے آپ سے بھی روا رکھتے ہیں۔ شادانی صاحب تقریباً تیس سال سے نزلے میں مبتلا ہیں۔ پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں جب ولایت گئے تھے تو وہاں کا تحفہ اس مرض کی شکل میں لیتے آئے تھے۔ دوسری مرتبہ جب ۱۹۵۶ء میں ولایت گئے اور نزلے کے علاج کے لیے وہاں کے ممتاز ڈاکٹروں سے رجوع کیا تو اُنھوں نے اس مرض کو لاعلاج قرار دیا۔ شادانی صاحب ولایت سے مایوس واپس آئے لیکن یہاں

لیکن یہاں میری خواہش پر ایک مقامی ڈاکٹر سے جس کا میں بڑا معتقد ہوں علاج کرانے پر آمادہ ہو گئے۔ دو ڈھائی مہینے اس کے زیرِ علاج رہے لیکن اس کا کیا علاج کہ جو مرض ان کے وبالِ جان بن کر رہ گیا ہے، اس کے معالجے میں ان کی باقاعدگی کا یہ حال تھا کہ دو روز کی دوا کئی روز میں ختم کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مرض مریض کے ساتھ رہ گیا بلکہ مرض کا ساتھ نہ چھوڑنے کی ذمہ داری بھی مریض پر رہ گئی۔

شادانی صاحب کے ساتھ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ کوئی چیز لینے کے لیے اپنے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گئے اور وہاں جا کر بھول گئے کہ کس چیز کے لیے اس کمرے میں آئے ہیں۔ اتنا ہی سچا مگر اس سے زیادہ ناقابلِ یقین واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ کسی سے ملنے کے لیے اپنے گھر سے عظیم پور کالونی گئے اور وہاں جا کر بھول گئے کہ کس سے ملنا ہے۔ مجبوراً رکشا والے (اس زمانے میں ان کے پاس کار نہ تھی) کو حکم دیا کہ نیل کھیت واپس لے چلو۔ اپنے حافظے کے ہاتھوں وہ کسی مشاعرے میں مشاعرے سے ایک روز قبل پہنچ گئے اور یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل اور اگزیکیوٹو کونسل کے بعض جلسوں میں جلسوں کے بعد۔ وہ اپنی آیندہ مصروفیات کو یاد رکھنے کے لیے ڈائری میں درج کر لیتے ہیں لیکن بعض اوقات انھیں ڈائری دیکھنا ہی یاد نہیں رہتا۔ با ایں ہمہ انھیں از خود رفتہ یا حواس باختہ آدمی نہیں کہا جا سکتا۔ ان کو دیکھ کر اور ان سے مل کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ہوش و حواس مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

عام طور پر ادیبوں اور شاعروں کی ایک پہچان یہ تصور کی جانے لگی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے کسی نہ کسی باب میں ابنارمل ضرور ہوتے ہیں۔ یعنی کہیں نہ کہیں ان کی کوئی چول ضرور کھسکی ہوتی ہے مگر میں نے شادانی صاحب کو ہر جگہ ہر حال میں نارمل پایا۔ وہ اپنی خوبیوں اور کمزوریوں، دونوں کے اعتبار سے نارمل

واقع ہوئے ہیں۔ محبت ہو یا نفرت، غم ہو یا غصہ، مسرت ہو یا ملال امید ہو یا اندیشہ، غرض ہر معاملے میں ان کے یہاں تناسب اور توازن کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ ان کی شخصیت میں بے اعتدالی کے نقوش چاہے خفی ہوں یا جلی کہیں نظر نہیں آتے۔

شادانی صاحب میں ایک بات ایسی ہے جو خصوصاً ادیب اور شاعر قسم کے لوگوں میں شاذ و نادر پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ شادانی صاحب نہ پان کھاتے ہیں۔ نہ شراب پیتے ہیں۔ نہ چائے کے عادی ہیں نہ سگریٹ کے شوقین۔ ان میں سے کسی چیز کی عادت انھیں کبھی نہیں رہی۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں شعر و ادب سے لطف اندوز ہونے تک کے لیے ان چیزوں کا استعمال ضروری خیال کیا جاتا ہو اگر بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ شادانی صاحب ان چیزوں کے بغیر شعر کیونکر کہہ لیتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن غالباً یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان چیزوں کے استعمال اور شعر و ادب کی تخلیق کے درمیان روایتی رشتہ جتنا بھی ہو بنیادی ربط کوئی نہیں۔

شادانی صاحب کو فلم دیکھنے سے دلچسپی ضرور ہے لیکن وہ اس کے بہت دلدادہ نہیں۔ اردو سے زیادہ انگریزی فلمیں دیکھتے ہیں۔ اس ملک کے تقریباً تمام پڑھے لکھے معقول آدمی ایسا ہی کرتے ہیں اور جو ایسا نہیں کرتے ان میں میرا بھی شمار ہے۔ شادانی صاحب فلم دیکھنے سے زیادہ کرکٹ کھیلنے اور دیکھنے کی بجائے سننے پر اکتفا کرتے ہیں۔ سننے سے دلچسپی ایسی ہے کہ دن دن بھر سنتے رہتے ہیں۔ یکم نومبر ۵۵ء کو جب پاکستانی ٹیم نے نیوزی لینڈ والوں کو ڈھاکے میں شکست دی تو شادانی صاحب کا دل خوشی کے مارے ناچ اٹھا، کہنے لگے پاکستانی کھلاڑیوں کو سونے کا ہار پہنانا چاہیے، سونے کا ہار! ان لوگوں نے پاکستان کے نام کو جتنا روشن کیا ہے اتنا کسی نے نہیں کیا۔ ہماری سفارت اور حکومت نے بھی نہیں۔ ریڈیو اناؤنسر نے جس جذباتی انداز میں پاکستانی ٹیم کی جیت کا اعلان کیا اس

سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اپنے وطن کی محبت ضرور ہے مگر افسوس کہ اس محبت سے کام لینے والی لیڈر شپ موجود نہیں۔

شادانی صاحب کے رہنے سہنے کا اسلوب اور ان کی زندگی کا معیار وہی ہے جو ان کے رتبے کے آدمی کا ہونا چاہیے۔ کار، ٹیلیفون، ریڈیو، ریڈیوگرام، گراموفون، ٹیپ رکورڈر، ریفری جیریٹر غرض ان کے یہاں زندگی کے وہ سارے لوازم موجود ہیں جن کی وجہ سے آدمی اونچے طبقے کے افراد میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن ان کے بعض عقیدت مندوں اور شاگردوں ہی کا خیال ہے کہ شادانی صاحب نے ان لوازم کی فراہمی میں خاصی تاخیر سے کام لیا ہے جس کا سبب ان کی ضرورت سے زیادہ جزرسی اور کفایت شعاری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خرچ کے معاملے میں وہ اگر بخیل نہیں تو دریا دل بھی نہیں۔ لیکن یہ بات کہہ کر میں ان کی کسی کمزوری کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں۔ دریا دلی ممدوح کے حق میں اتنی اچھی ثابت نہیں ہوتی جتنی مداحوں کے لغت میں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دُنیوی امور میں شادانی صاحب فن کار سے زیادہ دنیا دار ہی نظر آتے ہیں۔ زندگی کی راہ میں بڑی احتیاط کے ساتھ قدم رکھتے ہیں۔ اپنے ایک ایک پیسے کی نگرانی اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے روپے اپنی نگرانی آپ کر سکیں[۱]۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ادنیٰ درجے کی چیزوں پر اکتفا کر لیتے ہوں

---

[۱] شادانی صاحب نے اپنی جزرسی کا ذکر پڑھ کر مندرجہ ذیل عبارت حاشیے پر لکھ دی تھی۔

"اس جزرسی کے باوجود ۳۴ برس یونیورسٹی میں ملازمت کرنے کے بعد بھی اتنا روپیہ پس انداز نہ کر سکا کہ چھوٹا موٹا ایک گھر بنا لیتا۔ باپ سے ترکے میں جو کچھ ملا تھا، اس رقم سے ایک مکان تیار کرایا تھا آخر مصارف سے مجبور ہو کر اسے چالیس ہزار میں بیچ ڈالا۔ وہ رقم بھی سب خرچ ہو گئی۔ اس کے بعد کار فروخت کی پندرہ ہزار روپے میں۔ یہ بھی مصارف کی نذر ہوا۔ بنک بیلنس نہ ہونے کے برابر ہے۔ کئی نادار عزیزوں کی کفالت میرے ذمے ہے اور بھی کئی ایسے مصارف ہیں جو باہر سے دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتے۔ یہ صفحہ اور اگلا صفحہ اگر ان واقعات کی روشنی میں لکھا جاتا تو عبارت کچھ اور ہوتی۔"

سگے۔ ان کی ضرورت اور ان کے ذوق کی ساری چیزیں ان کے حسنِ ذوق کی آئینہ دار ہوتی ہیں، البتہ نام و نمود یا شان و شوکت کے مظاہرے کے لیے خواہ مخواہ سخاوت یا ضیافت پر نہیں اُتر پڑتے۔ شعبۂ فارسی و اردو کا صدر ہونے کے باوجود تقسیم ہند کے کچھ عرصے بعد تک آنے جانے کے لیے سائکل ہی سے کام لیتے تھے۔ جب ہرنیا کے آپریشن کی بدولت سائکل کا استعمال ان کے لیے ممنوع ٹھہرا تو ایک مدت تک رکشا کے علاوہ بس پر بھی آتے جاتے رہے۔ آج سے کئی سال پہلے جب ان کے یہاں ٹیلیفون لگا تو ان کے شاگرد ارشد کاکوی نے مجھ سے ازراہ مذاق کہا تھا کہ شادانی صاحب کے یہاں ٹیلیفون اب لگا ہے حالانکہ اس کی ضرورت اور استطاعت پہلے سے موجود تھی۔ ضرورت تو انھیں ریفری جیریٹر اور کار کی بھی ہے جنھیں وہ اب تک بیکار سمجھ رہے ہیں۔ اگرچہ اُنھوں نے زندگی اور زمانے کا سرد و گرم بہت چکھا ہے پھر بھی کھانے پینے کی چیزوں کو ان کی نوعیت کے مطابق ٹھنڈا اور گرم کر کے نہ کھانا کھانے کے ساتھ زیادتی ہے، خصوصاً جب کہ ایسا کرنے کی استطاعت موجود ہو۔" اب جب کہ وہ کار پر چلتے ہیں اور کھانے کو اس کی نوعیت کے مطابق رفری جیریٹر میں ٹھنڈا کر کے کھاتے ہیں تو ان کے بعض یونیورسٹی کے دوستوں کو اصرار ہے کہ وہ اپنے موجودہ مکان کو چھوڑ کر یونیورسٹی کے بنوائے ہوئے کسی نئے بنگلے میں آجائیں اور اپنے پُرانے طرز کے فرنیچر اور کتابی الماریوں کو فروخت کر کے گھر کو آرائش و زیبائش کے جدید سامانوں سے آراستہ کریں۔ لیکن شادانی صاحب "ماڈرن" سے "الٹرا ماڈرن" بننے کے لیے تیار نہیں جب کہ اس میں خرچ بھی زیادہ پڑتا ہو۔

شادانی صاحب کی زندگی میں امراض و حوادث کو بڑا دخل رہا ہے۔ وہ مریض پیدا ہوئے اور زندگی میں کئی بار سخت بیماریاں اُٹھا چکے ہیں۔ دو مرتبہ آپریشن سے بھی دو چار ہو چکے ہیں۔ ایک مرتبہ ہرنیا کے سلسلے میں آپریشن کرانا پڑا۔ دوسری دفعہ پیٹھ میں ایک غدود کا آپریشن۔ گزشتہ تیس برس سے نزلہ ایسا دامن گیر ہے جو غالباً ان کے دم کے ساتھ رہے گا۔ اس کی وجہ سے آئے دن بغیر کسی نوٹس کے ان

کی طبیعت ناساز ہو جاتی ہے، بے طرح چھینکیں آنے لگتی ہیں، بخار آجاتا ہے، سر میں شدید درد پیدا ہو جاتا ہے اور ناک سے ریزش کا سلسلہ ہر دس منٹ پر ایک رومال بھگو کر رکھ دیتا ہے۔ نزلے کے حملے کا اثر انھیں کسی کام کے قابل نہیں چھوڑتا۔ بعض اوقات اپنے گھر پر بھی ملاقاتیوں سے ملنا ان کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ لیکن صحت کی اس مسلسل خرابی اور پیرانہ سری کے باوجود وہ دیکھنے میں مریض یا مضمحل نہیں معلوم ہوتے بلکہ جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے چست، تندرست اور شگفتہ و شاداب نظر آتے ہیں۔

شادانی صاحب کئی بار جان لیوا حادثوں سے بال بال بچے ہیں۔ ایک مرتبہ لڑکپن میں جب کہ دس بارہ سال کی عمر تھی، سنبھل میں ایک تالاب کے جزیرہ نما حصے پر بیٹھ کر مچھلی مار رہے تھے، تفریحاً تالاب میں دو ایک طرف پاؤں ڈالا تو گھٹنے بھر پانی پایا۔ تیسری سمت جو پاؤں ڈالا تو بالکل ڈوب گئے۔ جیسے ہی ڈوبے کسی نے فوراً غوطہ لگا کر انھیں کھینچ نکالا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جہاں ڈوبے تھے اس پانی کے نیچے کنواں تھا۔ گویا کنواں تالاب میں ڈوبا ہوا تھا اور شادانی صاحب کنوئیں میں ڈوبے۔ دہرہ دون میں ایک مرتبہ تانگے پر بیٹھے کہیں جا رہے تھے موٹر سے تصادم ہو گیا۔ سخت چوٹ آئی۔ آج تک انگلیاں ٹیڑھی نظر آتی ہیں اور سر پر جو سلائی ہوئی تھی اس کا نشان بھی موجود ہے۔ ایک مرتبہ ٹرین میں سفر کر رہے تھے، ٹرین کسی پہاڑی مقام سے گزر رہی تھی۔ پٹری کے دونوں طرف بہت گہرا غار تھا۔ ٹرین پٹری سے اتر گئی لیکن خدا کا شکر کہ گری نہیں۔ جنوری ۱۹۵۲ء کی بات ہے "ٹکر" کے عنوان سے ایک سچی کہانی مکمل کر کے دن کے دو بجے گھر سے یونیورسٹی آرہے تھے کہ انجینیرنگ کالج کے سامنے ایک جیپ ان کی رکشا سے ٹکرا گئی۔ کولھے اور بائیں پیر میں معمولی چوٹ لگی۔ وہ رکشا کے جس جانب گرے تھے اگر اس کی دوسری طرف گرتے تو اس حادثے کے ٹریجیڈی بننے میں کوئی کسر باقی نہ رہتی۔ مئی ۱۹۵۸ء میں جب لیڈر ایکس چینج پروگرام کے ماتحت امریکہ کا سفر کر رہے تھے، انھوں

نے میرے نام اپنے ایک خط میں لکھا "امریکہ کے دوران قیام میں چھوٹے چھوٹے حادثے تو کئی پیش آئے لیکن رات تو بس خیر ہی ہوگئی۔ سڑک پار کر رہا تھا، دونوں طرف سے کاریں آ جا رہی تھیں اس لیے دوڑ کر چلا۔ سڑک میں ذرا نشیب تھا۔ پاؤں پھسل گیا اور بُری طرح گرا۔ اتنے میں ایک کار بڑی تیز رفتار سے سر پہ آگئی۔ میں اُٹھ کر تیزی سے بھاگا اور جان بچ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر اپنا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ کئی جگہ چوٹ لگی ہے۔ دونوں گھٹنے زخمی ہوئے، بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں لہولہان، دونوں ہاتھوں کی گدیاں بُری طرح چھل گئیں اور نیل پڑ گئے۔ بائیں شانے میں زور کا جھٹکا آیا جس کی وجہ سے بہت درد ہے، رات بھر سو نہ سکا، مالی نقصان بھی خاصا ہوگیا۔ نیا سوٹ پہنے ہوئے تھا جو بہت قیمتی تھا۔ پتلون میں گھٹنے پر سوراخ ہو گئے گھڑی کی BAND پارہ پارہ ہوگئی۔ جس وقت میں گرا ہوں عینک میرے ہاتھ میں تھی خدا جانے کس طرح صحیح سالم بچ گئی۔ بہرحال 'ویے بخیر گذشت' والا معاملہ ہوا۔

ذاتی ملاقات ہو، ادبی محفلیں ہوں، تعلیمی یا ثقافتی کانفرنسیں ہوں، شادانی صاحب کسی موقع پر کسی شخصیت سے چاہے اس کی شہرت اور عظمت کتنی ہی کیوں نہ ہو مرعوب ہونا جانتے ہی نہیں۔ بڑے سے بڑے آدمی سے کسی مسئلے میں اختلافِ رائے ہو جائے تو اس کے اظہار میں اسی بیباکی اور خود اعتمادی سے کام لیں گے جو چھوٹوں سے بات یا بحث کرتے وقت بڑی آسانی کے ساتھ روا رکھی جاتی ہے۔ وہ کسی کی بڑائی اور بزرگی صرف اس بنا پر تسلیم نہ کریں گے کہ ایک دُنیا اُسے تسلیم کرتی ہے۔ کسی یگانۂ روزگار کے قول سے صرف اس لیے اتفاق نہ کریں گے کہ وہ کسی یگانۂ روزگار کا قول ہے۔ ان کے نزدیک قول کی صحت اور صداقت سب کچھ ہے قائل کی عظمت اور اہمیت کچھ بھی نہیں۔ لیکن جہاں وہ بڑوں سے مرعوب نہیں ہوتے وہاں چھوٹوں سے جائز طور پر متاثر ہوئے بغیر بھی نہیں رہتے۔ ۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ رسالہ نقوش لاہور کا کوئی تازہ شمارہ آیا ہوا تھا۔ شادانی صاحب چونکہ موجودہ لکھنے والوں کو بہت کم پڑھتے ہیں اس لیے ایک دن اُنھیں خیال آیا کہ ذرا دورِ حاضر کے

بعض ممتاز افسانہ نگاروں کو پڑھ کر دیکھا جائے کہ ان کے یہاں موضوع اور تکنیک کی کون سی ندرتیں کارفرما ہیں۔ چنانچہ "نقوش" میں کئی ممتاز لکھنے والوں کے افسانے پڑھ گئے۔ ایک دن شام کو مجھ سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے "مجھے تو ان مشہور افسانہ نگاروں کے افسانوں میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ البتہ آج "الحمرا" (لاہور) میں ایک بالکل گمنام افسانہ نگار (افسوس کہ مجھے اس کا نام اور اس کے افسانے کا عنوان یاد نہیں رہا) کا ایک افسانہ بہت پسند آیا۔ موضوع تو معمولی ہی ہے لیکن اس نے بڑے فن کارانہ انداز میں لکھا ہے۔ اسی طرح "نیرنگ خیال" لاہور کے تازہ شمارے میں الماس رؤف کا مزاحیہ مضمون "او نٹ" بے حد پسند آیا۔ میں نے افسانہ اور مضمون دونوں کی تعریف میں ایڈیٹروں کے نام خط لکھے ہیں اور دونوں کے پتے مانگے ہیں"۔ مجھے شادانی صاحب کے خط لکھنے پر بڑی حیرت ہوئی خصوصاً اس لیے کہ وہ نئے لکھنے والوں کو پڑھنے تک کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ان کی تعریف میں ان کو یا ایڈیٹروں کو خط لکھنا تو بڑی بات ہے۔

شادانی صاحب کی شاعری اور سچی کہانیوں سے جو شخصیت برآمد ہوتی ہے وہ نفسیات کی اصطلاح میں "سرتاسر" دروں بیں" ہے۔ ان کی شاعری میں معاصرانہ حالات کی تصویر یا ترجمانی کہیں نہیں ملتی۔ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس کائنات کے اندر سانس لے رہے ہیں، اس سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ وہ تو اپنی کائنات آپ ہیں۔ اسی طرح ان کی سچی کہانیاں بھی زندگی کے داخلی پہلو ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کہانیوں میں بھی لکھنے والا زندگی کے خارجی مسائل اور معاملات سے دلچسپی لیتا نظر نہیں آتا۔ لیکن جیسا کہ خود ماہرین نفسیات نے تسلیم کیا ہے کوئی انسانی شخصیت نہ تو سرتاسر "دروں بیں" ہوتی ہے اور نہ یکسر "بیروں بیں"۔ داخلی شخصیتوں میں کسی نہ کسی حد تک خارجیت پسندی بھی ہوتی ہے اور خارجی شخصیتوں میں کسی نہ کسی حد تک داخلیت پسندی بھی۔ شادانی صاحب بنیادی اور مجموعی طور پر یقیناً تو داخلی ہی شخصیت لیکن وہ اتنے شدید داخلیت پسند ہرگز

نہیں کہ دوسروں کے کام بالکل نہ آسکیں۔ اگرچہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو لوگوں سے ان کے دکھ درد کا حال پوچھ پوچھ کر ان کے دکھ درد میں شریک ہو جاتے ہیں یا کسی کی امداد کے معاملے میں اپنی آخری پونجی تک نذر کر دینے میں تامل نہیں کرتے (دنیا میں ایسے ہوتے ہی کتنے ہیں ؟) لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر شادانی صاحب کی سعی و سفارش سے کسی کی مقصد برآری ہوسکتی ہے تو وہ اس سے دریغ نہیں کرتے۔ میں نے بعض اوقات نہایت معمولی آدمیوں کی سفارش کے لیے انھیں اپنی مصروفیات کے باوجود ان لوگوں کے پاس جاتے دیکھا ہے جن سے غرض مندوں کی غرض وابستہ تھی۔

امداد و اعانت کے معاملے میں ان کی سیرت کا ایک پہلو ایسا ہے جو اب تک میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔ جب کوئی شخص اپنوں میں سے کسی کو ملول یا مغموم دیکھتا ہے تو عموماً چاہے وہ اس کے ملال و مصیبت کو دور کرنے کی نیت یا صلاحیت رکھتا ہو یا نہیں لیکن وہ اس کے ملال و مصیبت کی روداد ضرور سننا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس شادانی صاحب کسی کے ملال و مصیبت کو دور کرنے کی کوشش کے باوجود ملال و مصیبت کی نوعیت اور تفصیل معلوم کرنے کی خواہش یا کوشش نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ گفتگو کے دوران میں فرمانے لگے "دیکھو ایک بات یاد رکھو۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کسی مصیبت زدہ کی امداد کرنے کے باوجود اس کی مصیبت کا حال دریافت نہیں فرماتے تھے۔ کسی نے ان کے اس طرزِ عمل کی وجہ پوچھی تو جواب دیا کہ ممکن ہے مصیبت کا بیان مصیبت زدہ کے لیے باعثِ شرم ہو لہٰذا مصیبت زدوں سے ان کے مصائب کی تفصیل نہیں پوچھنی چاہیے۔ اس قول کے علاوہ ایک بات اور ہے جس کی وجہ سے میں (شادانی صاحب) کسی کی تکلیف اور پریشانی کا حال دریافت نہیں کرتا۔ وہ یہ کہ فرض کرلو میں کسی کی تکلیف اور پریشانی کا حال جاننے کے بعد اسے دور کرنے سے معذور ہوں۔ ایسی صورت میں مجھے اس خیال سے تکلیف ہوگی کہ میں فلاں کے

لیے کچھ نہیں کر سکتا اور مصیبت زدہ شخص کو اس خیال سے رنج ہوگا کہ میں اس کی مصیبت کو جاننے کے باوجود اس کے لیے کچھ نہیں کرتا۔" غالباً اسی صورتِ حال سے بچنے کے لیے شادانی صاحب کسی کے ذاتی معاملات و مسائل سے دلچسپی نہیں لیتے لیکن جب کوئی اپنے معاملات و مسائل میں ان کی مدد کا طالب ہوتا ہے تو وہ حتی المقدور اس سے دریغ بھی نہیں کرتے۔

شعر کی خوبی اور خامی کو پرکھنے میں شادانی صاحب کو جو بصیرت اور مہارت حاصل ہے، اس کے پیشِ نظر انھیں اچھے سے اچھا شعر سناتے ہوئے خواہ وہ اپنا ہو یا کسی اور کا میرے دل میں یہ خوف ضرور کارفرما رہا ہے کہ نہ جانے یہ شعر ان کی نظر سے صحیح سلامت بچ سکے گا یا نہیں۔ بسا اوقات ان کی تنقید کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ شعر (اگر اپنا ہے) ضائع کر دوں اور اپنی پسند کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بہر حال سینے سے لگائے رکھوں۔ مجھے شعر گوئی کی دقتوں کا اندازہ شعر کہتے وقت اتنا کبھی نہ ہوا جتنا شعر پر شادانی صاحب کے عمل جراحی کو دیکھ کر۔ اگر شعر میں کوئی باریک سے باریک اور خفی سے خفی کوتاہی یا کمی ہے تو شادانی صاحب سنتے ہی جبلی طور پر کہہ دیں گے اس میں کہیں نہ کہیں کوئی کسر ضرور ہے، پھر سوچیں گے اور تھوڑی ہی دیر میں بتا دیں گے کہ اس میں یہ کسر ہے۔ آج سے کئی سال پہلے ایک مقامی انگریزی رسالے کے ایڈیٹر نے مجھ سے فرمائش کی کہ شادانی صاحب سے اردو کی چند اچھی جدید نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرا کے دیجیے۔ اس زمانے میں میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ ترجمے کے لیے جو نظمیں میں نے منتخب کیں ان میں ساحر لدھیانوی کی نظم "تاج محل" بھی تھی۔ سب سے پہلے شادانی صاحب نے اس کا ترجمہ کرنے کی بجائے اس پر ایسی تنقید شروع کی کہ نہ صرف وہ نظم میری نظر سے گر گئی بلکہ خود میں اپنی نظر سے گر گیا۔ اس وقت اس نظم پر ان کے سارے اعتراضات یاد نہیں صرف اتنا یاد ہے کہ انھوں نے نہ صرف نفسِ موضوع کے اعتبار سے بلکہ ہیئت کے لحاظ سے بھی اس نظم کو ناقص قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ اس کی ہیئت میں

کوئی نظام (ORDER) نہیں ہے۔ قافیوں کے استعمال میں خوش آہنگی کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ مثلاً ایک شعر ہے ؂

کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے ان کے جذبے
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

"اپنی ہی طرح مفلس" پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ پنجابی طرزِ بیان ہے۔ "اپنی" کی جگہ "ہماری" ہونا چاہیے تھا۔ اس نظم کا ایک مصرع ہے ۔'میری محبوب! پس پردۂ تشہیر وفا'۔ اس پر فرمایا کہ لفظ تشہیر کا استعمال بے محل ہے۔ ؏ 'ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود'۔ اس مصرع پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ غریبوں کے 'مقابر' کہاں سے آئے۔ غریبوں کی قبریں ہوتی ہیں نہ کہ مقابر۔

ایک مرتبہ شوکت سبزواری صاحب اور میں دونوں ان کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ شادانی صاحب رسالہ 'آج کل' دہلی کے ایک خاص شمارے کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ وحشتؔ کلکتوی کی غزل پر نظر ٹھہر گئی۔ ان کا مطلع تھا ؂

خدا کرے یہ مصیبت نہ ہو کسی کے لیے
کہ موت کا سا سہے رنج زندگی کے لیے

شادانی صاحب نے یہ شعر ہم لوگوں کو سناتے ہوئے کہا "کا سا سہے" نے مصرع کو غارت کر دیا۔ شوکت صاحب نے اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا۔ 'واقعی'۔ اسی غزل کا دوسرا شعر تھا ؂

ہے کام تجھ کو جو کرنا تجھی کو کرنا ہے
کسے پڑی ہے کہ کوشش کرے کسی کے لیے

شادانی صاحب نے یہ شعر پڑھتے ہی فرمایا۔ پہلا مصرع یوں بہتر ہو سکتا تھا ؎
تجھی کو کرنا ہے جو کام تجھ کو کرنا ہے
اربابِ نظر مانیں گے کہ ترمیم نے شعر کو بہتر بنا دیا۔ اسی غزل کا ایک اور شعر تھا ؎

فریب خوردۂ عیش جہاں کا ہے یہ حال
کہ روئے عمر بھر اک لحظے کی ہنسی کے لیے

شعر سنتے ہی شوکت صاحب نے فرمایا کہ دوسرے مصرعے میں 'کہ روئے' کی جگہ 'کہ رو دیا' بھی تو ہو سکتا تھا۔ شادانی صاحب نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ "فریب خوردۂ عیش" کے اعتبار سے 'کہ رو دیا' ہی لکھنا چاہیے تھا اگرچہ "فریب خوردۂ عیش" سے ان کی مراد ان تمام لوگوں سے ہے جو فریب خوردۂ عیش ہیں لیکن اس ترکیب سے جمع کا صیغہ نہیں نکلتا۔

زبان، محاورات، شاعری، عروض ان سب میں استادانہ دستگاہ رکھنے کے باوجود انھیں استادِ سخن بننے اور شاگرد پالنے کا شوق کبھی نہیں رہا۔ جو لوگ خود اپنے شوق سے ان کے شاگرد بن جاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ انھیں کسی کے کلام پر اصلاح دینے سے کتنی دلچسپی ہے۔ اگر کوئی شاعر ان کے یہاں جا کر انھیں تنہا پا کر اپنے کلام پر اصلاح لے لے تو لے لے ورنہ اس کلام پر ان کی اصلاح ممکن نہیں جو اسی غرض سے ان کے پاس چھوڑ دیا گیا ہو۔ ان کے شاگرد کتنے ہی جوہر قابل کیوں نہ ہوں وہ ان کی ذہنی تربیت پر ریاضت کے عادی نہیں۔ وہ اپنے شاگردوں میں شعر و ادب کے ذوق کو بار آور ہوتے دیکھ کر خوش ضرور ہوتے ہیں۔ ان کی شعری اور ادبی کاوشوں کو سراہتے بھی ہیں لیکن اپنے شاگردوں کے ذہن و ذوق کی تعمیر میں عملی طور پر معاون

نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ شوق اور صلاحیت رکھنے والے ان سے مل کر ان کی صحبتوں میں بیٹھ کر ان سے سیکھتے بہت کچھ ہیں اگرچہ وہ سکھاتے کچھ بھی نہیں۔

جس زمانے میں میں ڈھاکا یونیورسٹی کا طالب علم تھا شادانی صاحب ایک تو صدر شعبہ ہونے کی وجہ سے دوسرے ڈین آف دی فیکلٹی آف آرٹس ہونے کے باعث کلاس بہت کم لیتے تھے۔ پھر بھی مجھے ایم۔ اے میں ان سے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایم۔ اے کے پہلے سال میں اُنھوں نے ہم لوگوں کو مومن پڑھایا تھا اور دُوسرے سال میں اقبال۔ مجھے نہ ان کے پڑھانے کا انداز پسند آیا نہ ایم۔ اے کے لیے مناسب معلوم ہوا۔ مومن ہوں یا اقبال وہ لفظی تشریح سے آگے نہیں بڑھتے۔ غالباً آگے بڑھ بھی نہیں سکتے۔ ان کا علم حد درجہ محدود ہے۔ بنیادی طور پر وہ اردو اور فارسی ادب کے آدمی ہیں لیکن اردو اور فارسی ادب کے معاملے میں بھی ان کی دل چسپیاں زبان، محاورات، قواعد اور عروض تک محدود ہیں۔ اُنھوں نے ادب کے کسی حصے کا بھی تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ وہ کسی ادیب یا شاعر کی بنیادی خصوصیات پر لکچر دینے سے ہمیشہ احتراز کرتے ہیں۔ نثر نگاروں سے ان کی دل چسپی اور بھی کم ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی کلاس میں کسی نثر نگار کا درس اپنے ذمے نہیں لیتے۔ اس معاملے میں جہاں اُنھیں اردو کے جدید ادب سے کوئی لگاؤ نہیں وہاں اُنھوں نے اردو کے قدیم ادب کا بھی کوئی خاص مطالعہ نہیں کیا۔ ایک یونیورسٹی پروفیسر کی حیثیت سے ان کا معلّمانہ کردار حد درجہ غیر اطمینان بخش ہے۔

لیکن معلّم کی حیثیت سے شادانی صاحب کی ایک خُوبی ایسی ہے جس نے مجھے متاثر کیا ہے وہ یہ کہ جو بات اُنھیں معلوم نہ ہوتی یا اگر کسی شعر کا مطلب سمجھنے میں اُنھیں اُلجھن ہوتی تو اس کے اعتراف و اظہار میں ذرا بھی تامل نہ کرتے۔ اپنی لاعلمی کو چھپانا ان کی فطرت کے منافی ہے جس کا ثبوت کلاس سے باہر بھی ملتا ہے۔ صرف مجھے بلکہ دوسروں کو بھی۔

آج سے کئی سال پہلے شعبۂ اردو کے لیے ایک ریڈر کے تقرر کا مسئلہ درپیش تھا۔ امیدواروں میں قاضی عبدالودود، مجنوں گورکھپوری، طاہر فاروقی اور شوکت سبزواری تھے۔ تقرر کرنے والی کمیٹی منجملہ اور لوگوں کے ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر زبیر صدیقی (صدر شعبۂ عربی کلکتہ یونیورسٹی) اور فضل احمد کریم فضلی (اس زمانے میں حکومت مشرقی پاکستان کے محکمۂ تعلیمات کے سیکرٹری تھے) پر مشتمل تھی۔ اس معاملے میں ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زبیر صدیقی کے اختلافات نے ایسی صورت اختیار کی کہ آخر کسی کا تقرر نہ ہو سکا۔ ایک سال بعد دوسری کمیٹی بنائی گئی اور امیدواروں کے نام کمیٹی کے بیرونی ارکان (جن میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور سید سلیمان ندوی بھی تھے) کے پاس بھیج دیئے گئے۔ دوسرے سال کے امیدواروں میں صرف تین شخص تھے۔ مجنوں گورکھپوری، شوکت سبزواری اور طاہر فاروقی۔ اس زمانے میں شادانی صاحب سے جب کبھی میں نے یا کسی اور نے پوچھا کہ ریڈر شپ کے امیدواروں میں کس کی کامیابی کا امکان زیادہ ہے تو انھوں نے یہی کہا کہ میں نے طے کر لیا ہے کہ میں کسی کی طرفداری نہیں کروں گا۔ کمیٹی والے جس کو منتخب کرلیں۔ مجھے تو ایک ریڈر چاہیے اور بس۔ ممکن ہے انھوں نے کسی امیدوار کی طرفداری نہ کی ہو لیکن ان کی گفتگو سے کبھی کبھار اتنا یقیناً ظاہر ہوتا تھا کہ پہلے وہ قاضی عبدالودود کے انتخاب کے متمنی تھے اور دوسرے سال جب انھوں نے اپنا نام واپس لے لیا تو شادانی صاحب کی ذہنی ہمدردیاں طاہر فاروقی کے ساتھ وابستہ تھیں۔ اس زمانے میں ان کا خیال تھا کہ مجنوں گورکھپوری اور طاہر فاروقی میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ ہر ایک میں کچھ خوبیاں ایسی ہیں جو دوسرے میں نہیں۔ اس غیر جانبدارانہ رائے (جو غیر جانبدارانہ ہونے کے باوجود میرے نزدیک غلط تھی اور ہے) کے باوجود وہ طاہر فاروقی کی صورت اور قابلیت سے بہت متاثر معلوم ہوتے تھے۔ ایک دن انھوں نے میرے سامنے ایک صاحب سے طاہر فاروقی کے نورانی چہرے (جب طاہر صاحب کے داڑھی تھی تو ان کا چہرہ واقعی نورانی معلوم ہوتا تھا) کا تذکرہ اور ان کی کتاب

"سیرتِ اقبال" کی تعریف کی تھی اور اس کے مقابلے میں مجنوں کی کتاب "اقبال" کے لیے انھوں نے قدرے حقارت آمیز لہجے میں 'کتبیا' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ معلوم نہیں شادانی صاحب کی ذہنی (عملی نہیں کہہ رہا ہوں) ہمدردیوں کا کرشمہ تھا یا کچھ اور کہ مجنوں گورکھپوری اور شوکت سبزواری کے مقابلے میں طاہر فاروقی کا انتخاب اور تقرر عمل میں آیا۔ ویسے بھی جہاں تک انتخاب کا تعلق ہے شادانی صاحب ہمیشہ اپنے دوست کو ووٹ دینے کے قائل ہیں، چاہے اس کا حریف اپنی اہلیت کے اعتبار سے کتنا ہی افضل کیوں نہ ہو۔

شادانی صاحب کو ڈھاکے میں رہتے ہوئے ۳۰ سال گزر گئے لیکن سرزمین بنگال میں اس دیرینہ قیام کے باوجود انھوں نے نہ تو یہاں کی زبان سیکھی نہ یہاں کے لباس اور مذاق کو اپنایا۔ بول چال، رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے غرض کہ زندگی کے ہر شعبے میں وہ یوپی کے نمائندے نظر آتے ہیں۔ بنگلہ انھیں نہیں آتی۔ لنگی وہ نہیں پہنتے۔ کھانے میں آج بھی انھیں چاول سے زیادہ روٹی اور مچھلی سے زیادہ گوشت مرغوب ہے۔ اپنے گھر پر ہمیشہ کرتا اور پاجامہ پہنتے ہیں، باہر جاتے وقت یا تو شیروانی میں ہوتے ہیں یا سوٹ میں۔ ادھر کئی سال سے وہ شیروانی سے زیادہ سوٹ میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ میں خود شیروانی کا شائق ہونے کے باوجود کچھ ایسا محسوس کرتا رہا ہوں کہ آدمی سوٹ میں جس قدر چاق چوبند نظر آتا ہے اتنا شیروانی میں نہیں۔ اب اسے سوٹ کی خوبی کہہ لیجیے یا میرے نقطۂ نظر کا کرشمہ کہ شادانی صاحب پر لباس تو دونوں ہی سجتے ہیں لیکن وہ سوٹ میں بڑے چاق چوبند دکھائی دیتے ہیں، جیسے ان کی عمر کچھ کم ہو گئی ہو اور ان کی جسمانی چستی اور ذہنی شگفتگی نسبتاً بڑھ گئی ہو۔

شادانی صاحب ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز اردو ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں اور جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے وہ یقیناً یہاں کی ممتاز ترین شخصیت ہیں۔ ان کی اس بزرگی کا اعتراف اور احترام ہر جگہ ہر حلقے میں

ہے لیکن وہ اپنی اس بزرگی اور بلند اخلاقی کے باوجود ڈھاکے میں ہر دل عزیز شخصیت کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ صاف لفظوں میں یوں سمجھیے کہ وہ مقبول اتنے نہیں جتنے نامقبول ہیں۔ ان کی اس نامقبولیت کا ایک بڑا سبب تو وہی حسد اور جلن ہے جو ابنائے زمانہ ارباب کمال سے روا رکھتے آئے ہیں۔ دوسری وجہ غالباً یہ ہے کہ اگرچہ وہ کسی کی دل آزاری کرنا نہیں چاہتے، پھر بھی ان کی بعض باتوں سے بعض لوگوں یا حلقوں کی دل آزادی ہو ہی جاتی ہے۔ مثلاً مشاعروں میں ان کی بدیہہ گوئی سے سامعین جس قدر محظوظ ہوتے ہیں بیشتر شعرا کی طبیعت اسی

قدر مکدر ہوتی ہے۔ ایسے شاعروں کا خیال یہ ہے کہ شادانی صاحب انھیں نیچا دکھانے کی غرض سے انھیں کی زمینوں میں فی البدیہہ شعر کہتے ہیں۔ بعض کو یہ شکایت رہی ہے کہ شادانی صاحب کے فی البدیہہ اشعار اس تاثر کو زائل کر دیتے ہیں جو ان کے کلام سے سامعین کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ شادانی صاحب کی عدم مقبولیت میں غالباً ان کی اس بُت شکنی کو بھی دخل رہا ہے جس کا ثبوت انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین میں دیا ہے۔ اظہار خیال کے سلسلے میں وہ آج بھی اپنی صاف گوئی اور بے باکی سے باز نہیں آتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض حلقے ان کے صرف دو ایک جملوں سے ہمیشہ کے لیے ان سے بددل اور بیزار ہو جاتے ہیں مثلاً ایک مرتبہ انھوں نے ڈھاکے کے نواب خاندان کے ایک شاعر بیدار بخت بیدار پر جو داغ کے شاگردوں میں سے تھے، اپنی ریڈیائی تقریر میں لکھ دیا تھا کہ ان کی موت نواب خاندان کے کئی اور شاعروں کی شاعری کی موت ثابت ہوئی یا پھر اپنی ایک انگریزی تقریر میں جس کا موضوع مشرقی پاکستان کی معاشرتی زندگی تھا انھوں نے کچھ ایسی حقیقتوں کی طرف اشارے کر دیتے تھے جن کی وجہ سے یہاں کے باشندوں میں خاصی برہمی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی نامقبولیت جہاں ان کے متعلق لوگوں کی بدگوئی اور افواہ تراشی میں ظاہر ہوتی ہے وہاں بعض اوقات اس کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض جلسوں اور تقریبوں میں یا تو انھیں نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی

ہے یا با دلِ نخواستہ مدعو کیا جاتا ہے۔ شادانی صاحب کی حساس طبیعت لوگوں کے اس رویے سے ناواقف نہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک مرتبہ اپنے ایک عزیز شاگرد کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ اب میں ڈھا کے میں ایک NECESSARY EVIL ہو کر رہ گیا ہوں۔

شادانی صاحب کے والد مرحوم اپنی اولادوں میں سب سے زیادہ شادانی صاحب ہی کو عزیز رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے اپنی زندگی کے آخری سال شادانی صاحب کے ساتھ گزارے اور انھیں کے مکان پر مرض الموت کی تکلیفیں جھیلتے ہوئے دُنیا سے گزر گئے۔ جب تک وہ زندہ رہے شادانی صاحب نے ان کی عافیت و سہولت کا ہمیشہ لحاظ رکھا۔ کئی سال پہلے شادانی صاحب دھان منڈی میں اپنا مکان بنوا رہے تھے۔ مکان بنوانے کے سلسلے کی ساری ذمہ داری، دوڑ دُھوپ مرحوم کے سر تھی۔ جب مکان کے دو تین کمرے بن گئے تو اُنھوں نے وہیں رہنا شروع کر دیا۔ مگر ناشتہ شادانی صاحب کے یہاں سے جاتا تھا جو عموماً نوکر لے جاتا تھا۔ میں نے کئی بار شادانی صاحب کو بھی ناشتہ یا کھانا لے جاتے دیکھا۔ ان کی جائے قیام نیل کھیت سے دھان منڈی کا فاصلہ ایک ڈیڑھ میل سے کم نہ ہوگا۔ شادانی صاحب وہاں جانے کے لیے نہ پورا لباس پہنتے نہ رکشا کرتے۔ کرتے اور پاجامے میں پیدل نکل جاتے۔ گرمیوں کے موسم میں جس دن گرمی زیادہ پڑتی سر پر ہیٹ رکھ لیتے۔ نئے اور نامکمل مکان میں کچھ عرصے تک رہنے کے بعد مرحوم پھر شادانی صاحب کے ساتھ رہنے لگے۔ وہ پُرانی وضع کے آدمی تھے۔ اس بنا پر اس آرام و آسودگی کے آرزومند بھی جو گھر کی بہو بیٹی اور پوتے نواسے کی خدمت گزاری کا نتیجہ ہوتی ہے نہ کہ ملازموں کے فرائض کی انجام دہی کا۔ لیکن مرحوم کو یہ نعمت میسر نہ تھی۔ ان کے بیشتر کام نوکر کے ہاتھوں انجام پاتے تھے اور اس دیس کے نوکروں میں فرض شناسی اور سلیقہ شعاری کم پائی جاتی ہے۔ چنانچہ قدم قدم پر ملازم کی بدولت بدمزگی کا سامنا رہا کرتا تھا۔ آقا اور ملازم کی زبانوں

کے فرق سے بھی کوفت انگیز صورت حال پیدا ہوتی رہتی تھی۔ مرحوم بنگالی اردو بول نہیں پاتے تھے۔ ملازم ان کی شستہ اردو ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتا تھا نتیجتاً ان کا کام ان کی خواہش کے مطابق نہ ہوتا۔ ملازم کی بدسلیقگی یا بے وقوفی سے انھیں زیادہ تکلیف پہنچ جاتی تو شادانی صاحب کے صبر وضبط کا پیمانہ چھلک پڑتا اور وہ ملازم کو ڈانٹ بتا کر خود وہ کام کر دیا کرتے جس کی مرحوم کو ضرورت ہوتی۔

مذہبی عقائد کے اعتبار سے شادانی صاحب اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد پکے مسلمان اور عمل کے اعتبار سے بیسویں صدی کے مسلمان ہیں۔ لیکن ان کے والد انیسویں صدی کے انسان بھی تھے اور مسلمان بھی۔ اسی لیے صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند۔ آخر عمر تک تیسوں روزے رکھتے رہے۔ شادانی صاحب روزہ نہ رکھنے کے باوجود ان کے افطار وسحری کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ رمضان کے مہینے میں بارہا یہ دیکھنے میں آیا کہ افطار سے کچھ دیر قبل شادانی صاحب ان کے لیے آم، انناس، باکوئی اور پھل خود اپنے ہاتھوں سے کاٹ رہے ہیں۔ مرحوم مجھ سے بہت گھل مل گئے تھے۔ اگر شادانی صاحب گھر پر نہ ہوتے تو دو دو گھنٹے تک ان سے گفتگو رہا کرتی۔ ان کی باتوں سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ اپنے گھر کے افراد میں سے کس کے مداح تھے اور کس کے شاکی۔ یہاں ان کے اس راز کو رسوا کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر اتنا بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ میں نے ان کی زبان سے شادانی صاحب کی کوئی شکایت کبھی نہیں سُنی بلکہ میں نے انھیں شادانی صاحب کی خدمت گزاری اور سعادت مندی کا ہمیشہ معترف پایا۔

شادانی صاحب کی سیرت میں انجم کے ذکر سے مفر نہیں۔ انجم جو اُن کے ایک عزیز ترین دوست کی بیٹی ہیں اور اب ان کی بہو بن چکی ہیں، اس وقت بھی جب وہ شادانی صاحب کے اعزہ میں نہ تھیں انھیں اپنے عزیزوں سے زیادہ عزیز تھیں۔ دبلی پتلی مگر متناسب جسم کی یہ حسین وجمیل لڑکی اپنی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر شادانی صاحب کی ذہنی اور ادبی زندگی میں بھی دخیل رہی ہے۔ عرصے کی بات

ہے شہید ملت لیاقت علی خاں کی یادگار میں ریڈیو پاکستان ڈھاکا سے ایک مشاعرہ نشر ہونے والا تھا۔ شادانی صاحب کی طبیعت ناساز تھی۔ نزلہ زوروں پر تھا اس لیے نظم نہ کہہ سکتے تھے لیکن عین مشاعرے کے روز جب کہ شادانی صاحب کی طبیعت نسبتاً زیادہ خراب تھی، بخار اور دردِ سر کی وجہ سے تکیے سے سر اُٹھانا دشوار تھا، مشاعرے سے دو تین گھنٹے پیشتر انجم بضد ہوگئیں کہ ابا! آپ کو مشاعرے میں شرکت کرنی ہی ہوگی۔ شادانی صاحب نے ہزار سمجھایا کہ بھلا میں مشاعرے میں کیونکر شریک ہوسکتا ہوں۔ طبیعت اس قدر ناساز ہے، نظم بھی نہیں کہی ہے اور نہ اس وقت نظم کہنا ممکن ہے۔ لیکن جب انجم شادانی صاحب کی ان تمام معذوریوں کے باوجود اپنے اصرار پر قائم رہیں تو انھوں نے کہا۔ اچھا کاغذ قلم اُٹھاؤ۔ اگر نظم ہوگئی تو مشاعرے میں جاؤں گا ورنہ نہیں۔ تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر شادانی صاحب نے نظم کہہ ڈالی۔ میں ریڈیو کا مشاعرہ نہ سن سکا۔ دوسرے دن جب شادانی صاحب نے مجھے اس نظم کے متعلق وہ ساری داستان سنائی جو ابھی بیان کی گئی تو میں سوچنے لگا کیا انجم، شادانی صاحب کے لیے تخلیقی تحریک کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں؟

انجم میڈیکل کالج کی طالبہ ہیں۔ اس کے باوجود شعر و ادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتی ہیں جس پر شادانی صاحب کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اور جلا ہوگئی ہے۔ اُنھیں نثر نگاری یا شعر گوئی سے کوئی تعلق نہیں لیکن ان میں شعر و ادب کے مطالعے کا ذوق، ان کے سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ایک مرتبہ شادانی صاحب نے "مغالطہ" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا۔ مجھے پڑھ کر سنایا۔ میں اپنی رائے ظاہر کر چکا تو اُنھوں نے کہا یہ افسانہ بہت طویل ہوگیا تھا۔ میں نے انجم کے کہنے پر اس کے دو صفحے حذف کر دیئے۔ دراصل وہ دو صفحے غیر ضروری تھے بھی۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی کہ ادب کے معاملے میں انجم کا مشورہ اتنا معقول ہوسکتا ہے کہ اس کی بنا پر شادانی صاحب جیسا محتاط فن کار دو صفحے حذف کر دے۔ لیکن جب میں نے اس حذف شدہ ٹکڑے کو منگا کر دیکھا تو انجم کے

مشورے کی معقولیت پر ایمان لانا ہی پڑا۔

یہاں تک شادانی صاحب کی شخصیت کے بارے میں آپ نے جو کچھ پڑھا وہ ۵۸ء تک لکھا جا چکا تھا۔ ۵۹ء میں جب پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا تو اس سلسلے میں مشرقی پاکستان کے اردو ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ جو ناانصافی اور حق تلفی ہوئی اس کی تلافی کے لیے شادانی صاحب نے اپریل ۵۹ء میں مشرقی پاکستان اردو رائٹرز گلڈ کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کی قیادت شادانی صاحب کے سپرد کی گئی۔ یہ قیادت ان کی شخصیت کے کن نئے گوشوں کو سامنے لائی۔ وہ اپنے اغراض و مقاصد میں کس حد تک کامیاب رہے۔ یہ تحریک ان کے مزاج و مسلک پر کس طرح اثر انداز ہوئی یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق سر دست کچھ لکھنا قبل از وقت ہوگا کیونکہ ابھی تک گلڈ سے متعلق جھگڑے قصۂ ناتمام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر یہ قصہ ناتمام نہ ہوتا جب بھی اس کا کیا ٹھکانا کہ مضمون مکمل ہوتا کہ نہ ہوتا۔

(۱۹۵۹ء)

ممتاز شیریں — "ہم سرحد کا سفر کر رہے ہیں"

اور جس شام نیم خوابی کے عالم میں ممتاز شیریں کی زبان سے یہ فقرہ ادا ہوا تھا اس کے دوسرے دن صبح کے سوا سات اور ساڑھے سات بجے کے درمیان اُنھوں نے اپنا یہ سفر مکمل کر لیا تھا۔ وہ زندگی کی سرحد پار کر چکی تھیں۔

جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے یہ سانحہ ۱۱ر مارچ ۱۹۷۳ء کو پیش آیا جب ممتاز شیریں ڈیڑھ دو ماہ تشویش ناک حد تک بیمار رہ کر اپنے شریکِ حیات ڈاکٹر صمد شاہین، اپنی بیٹیوں پرویزا اور نگریزا اور اردو ادب کو داغِ مفارقت دے گئیں۔

میرے لیے ممتاز شیریں کی وفات صرف ایک ادبی سانحہ نہیں بلکہ ذاتی سانحہ بھی ہے۔ یوں تو ماہ و سال کے اعتبار سے ممتاز شیریں اور شاہین صاحب سے میرے تعلقات تقریباً دس سال پرانے ہیں لیکن ستمبر ۱۹۷۱ء سے یعنی جب میں کراچی سے اسلام آباد آیا کئی وجوہ کی بنا پر میرا سب سے زیادہ ملنا جلنا اسی گھرانے سے رہا۔

ڈاکٹر صمد شاہین اور ممتاز شیریں سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۳ء میں ہوئی تھی جب شاہین صاحب کو اپنی ملازمت کے سلسلے میں چھ مہینے ڈھاکے رہنا پڑا۔ اس زمانے میں غالباً دو تین مہینے کے لیے ممتاز شیریں بھی وہاں آ گئی تھیں۔

ایک مرتبہ میری دعوت پر میاں بیوی دونوں نے غریب خانے کو رونق بخشی تھی۔ گذشتہ ڈیڑھ سال کے اندر جہاں میں تقریباً ہر ہفتے شاہین صاحب کے یہاں جاتا رہا ہوں وہاں شاہین صاحب، اور ممتاز شیریں بھی کئی مرتبہ میرے یہاں آئیں اور کسی رسمی دعوت کے بغیر آئیں ممتاز شیریں آخری مرتبہ میرے یہاں جنوری ۱۹۷۳ء میں آئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میری بیوی اسلام آباد کے سرکاری اسپتال پولی کلینک میں چھ دن زیرِ علاج رہ کر واپس آچکی تھیں اور ممتاز شیریں کی بائیں ٹانگ سُن ہونے لگی تھی۔ میرے ڈرائینگ روم کی دہلیز زمین سے کوئی ایک بالشت اُونچی ہے۔ ممتاز شیریں کو اتنی اُونچائی پر بھی قدم رکھنے میں قباحت پیش آئی تھی۔ بہر حال جب وہ شاہین صاحب کے ساتھ میرے یہاں شام کے وقت آئیں تو دیر تک بیٹھیں۔ اس دن ٹی وی پر ڈاکٹر انور سجّاد کا ڈرامہ 'زنجیر' آنے والا تھا۔ میاں بیوی دونوں نے اس ڈرامے کا انتظار کیا اور اسے دلچسپی سے دیکھ کر واپس گئے۔ کیا خبر تھی کہ اس رات ممتاز شیریں میرے یہاں آخری مرتبہ آئی تھیں۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب دسمبر ۱۹۷۲ء کے پہلے ہفتے میں میری بیوی اپنی مسلسل علالت کے زیرِ اثر ایک دن بے ہوش ہوگئیں اور مجھے ان کو پولی کلینک میں داخل کرانا پڑا تو ان کے داخلے میں مجھے ممتاز شیریں کی سفارش سے بڑی مدد ملی تھی۔ میری بیوی پولی کلینک میں چھ روز رہ سکیں۔ اس دوران میں ممتاز شیریں دو مرتبہ ان کی عیادت کو آئیں۔ یکم فروری ۱۹۷۳ء کو بے ہوشی کے عالم میں خود ممتاز شیریں کو پولی کلینک میں داخل کیا گیا۔ اُنھیں بھی وہی بیڈ ملا جو میری بیوی کو ملا تھا۔ قسمت کی بات کہ ان کا بسترِ علالت ان کے حق میں بسترِ مرگ بھی ثابت ہوا۔ پولی کلینک میں داخل ہونے کے بعد جب ان کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی تو اُنھوں نے بہت چاہا کہ گھر جاکر غسل کرلیں اور ضروری کپڑے اور چیزیں اسپتال لیتی آئیں لیکن اُنھیں گھر جاکر غسل کرنے کی اجازت نہ مل سکی۔ ان کی قسمت میں گھر پر صرف ایک ہی غسل باقی رہ گیا تھا جس کے بعد انھیں

اسپتال جانے کی بجائے وہاں چلے جانا تھا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

ممتاز شیریں کوئی ڈیڑھ سال سے بیمار تھیں مگر ان کی بیماری ایسی تھی کہ وہ اپنے آخری دو مہینوں سے پہلے دیکھنے والوں کو صحت مند اور چاق چوبند ہی نظر آئیں۔ ہوتا یہ تھا کہ انھیں جسم کے متعدد حصوں پر کھجلی سے مشابہ دانے نکل آتے تھے جنھیں ان کے معالج نے الرجی قرار دے رکھا تھا۔ اس مرض کے علاوہ انھیں ذیابیطس اور بواسیر کے عارضے بھی تھے۔ ان تمام امراض کے باوجود ان کی زندگی معمول کے مطابق تھی۔ کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ ہنستی بولتی شکل دُنیا سے بہت جلد روپوش ہو جانے والی ہے۔

گزشتہ ایک ڈیڑھ سال سے متذکرہ الرجی میں مبتلا ہونے کے باوجود ممتاز شیریں گھر کے سارے ضروری کام انجام دیتی رہیں۔ صبح کے پانچ بجے شاہین صاحب کو چائے بنا کر دینا، پھر ناشتہ کرانا۔ نو دس بجے مارکیٹنگ کے لیے بازار جانا۔ مہمانوں کے لیے خاص چیزیں پکانا، شام کے وقت شاہین صاحب کے ساتھ دوستوں کے یہاں ملنے کے لیے جانا، غرض کہ اس طرح کے سارے فرائض سے عہدہ برآ ہوتی رہیں۔ اپنی الرجی کے علاج کے سلسلے میں تقریباً ہر تیسرے چوتھے دن تنہا پولی کلینک جاتیں اور پیدل ہی جاتیں۔ لیکن دسمبر ۱۹۷۲ء کے وسط سے ان کے امراض میں اضافہ شروع ہو گیا۔ پہلے ان کی بائیں ٹانگ سُن ہونا شروع ہوئی۔ ۲۵۔ جنوری ۱۹۷۳ء سے ان پر بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ جب تیسری مرتبہ بے ہوش ہو گئیں تو پولی کلینک میں داخل کی گئیں۔ ایک دو روز کے اندر طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ بائیں ٹانگ بھی ٹھیک ہو گئی۔ لیکن اُٹھنے بیٹھنے میں کمر کے حصے میں دشواری اور معذوری پیدا ہو گئی جسے SPINAL CHORD کی خرابی کا نتیجہ سمجھا گیا۔ اس کے لیے PHYSIO THERAPY علاج شروع ہوا۔ ابھی یہ علاج مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ اسپتال میں ان پر بے ہوشی کے دورے پڑے۔ اس بے ہوشی پر KIDNEY INFECTION کا شبہ ہوا۔ اس سلسلے میں کسی قسم کے ٹسٹ کے لیے پیٹھ میں پنکچر کیا گیا جس کی وجہ سے بارہ گھنٹے

تک انھیں کروٹ لیے بغیر سونا پڑا۔ اس بنکچر کے تین چار دن بعد انھیں ڈائریا ہو گیا۔ جسم کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔

میں نے بارہا محسوس کیا تھا کہ ان کی حالت تشویشناک ہو یا نہ ہو لیکن اس بات کی متقاضی ضرور ہے کہ اپنوں میں سے کوئی آدمی ان کے پاس ہر وقت موجود رہے جو انھیں اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے میں مدد دینے کے علاوہ ان کے مورال کو بلند رکھنے کی کوشش کرتا رہے۔ شاہین صاحب اپنی منصبی مصروفیتوں اور معذوریوں کے باعث صرف شام کے وقت ان کے پاس بیٹھ پاتے تھے۔ کچھ دنوں کے لیے انھوں نے اپنی ایک بھانجی کو پشاور سے بلا لیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ اسکول میں ملازمت کرتی ہیں اس لیے وہ بھی ایک ہفتے سے زیادہ ٹھہر نہ سکیں۔ میرا جی بہت چاہا کہ میں اپنی بیوی کو ان کے پاس زیادہ سے زیادہ وقت گذارنے کے لیے کہوں اور وہ بھی اس خدمت کو اپنی خوش نصیبی تصور کرتیں، لیکن ہمارے چھوٹے بچے کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ ممتاز شیریں کی دوستوں میں نثار عزیز بٹ اور اختر جمال ہر روز انھیں دیکھنے آتیں اور ان کے پاس خاصا وقت گزار کر جاتیں۔ لیکن یہ بھی ان کے مسئلے کا حل نہ تھا۔ اسپتال کی نرسیں اور آیائیں ان کی خدمت میں کوتاہی نہیں کرتی تھیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کے اندر ایک قسم کی تنہائی، بے بسی اور بیچارگی کا احساس پیدا ہونے لگا تھا جس کا اندازہ مجھے ان کے بعض جملوں سے ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کس طرح ان کی مدد کروں یا شاہین صاحب کو کس طرح دفتر جانے سے روک دوں۔

ایک دن ممتاز شیریں نے مجھ سے کہا کہ اب میں اچھی نہیں ہو سکتی۔ اسی دن کا واقعہ ہے کہ جب میں انھیں دیکھنے کے لیے پولی کلینک کی بالائی منزل پر جا رہا تھا تو شاہین صاحب کے ایک پرانے رفیقِ کار اور بے تکلف دوست جہانگیر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہاں کیسے آئے تو معلوم ہوا کہ ان کی بیوی بیمار ہیں۔ کوئی آپریشن ہوا ہے۔ پھر انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کس سلسلے میں آئے ہیں تو میں نے ممتاز شیریں کا ذکر کیا۔ اس پر انھوں نے کہا "اور ڈاکٹر صاحب

(شاہین صاحب کو ان کے احباب عام طور پر ڈاکٹر صاحب ہی کہتے ہیں) کہاں ہیں؟ میں نے کہا اس وقت یا تو دفتر میں ہوں گے یا دفتر سے واپس آرہے ہوں گے۔ اس پر جہانگیر صاحب نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب سے کہیئے کہ اپنی PRIORITIES کو درست کریں۔ پہلے گھر، بعد میں دفتر۔ میں نے کہا آپ ان کے بے تکلف دوست ہیں، آپ خود کیوں نہیں کہتے لیکن وہ میرے جواب کا جواب دیئے بغیر اپنی بیوی کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

میرا حافظہ کچھ ایسا ہے کہ مجھے باتیں ترتیب کے ساتھ یاد نہیں رہتیں مجھے اکثر یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کون سی بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور اس کا سیاق وسباق کیا تھا۔ بہرحال اس دن جو باتیں ان سے ہوتی رہیں ان میں اپنی نگریا، والی ممتاز شیریں اور صمد شاہین کا بھی ذکر آیا۔ کسی عنوان سے اُنھوں نے اپنی شادی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ شاہین صاحب سے ان کی شادی ہوئے ہیں۔ دونوں کے ادب پرست اور ہم ذوق ہونے کے علاوہ اس بات کو بھی بڑا دخل تھا کہ شاہین صاحب کے پاس مغربی ادب کی نہایت عمدہ لائبریری تھی جس میں ہزاروں کتابیں تھیں۔ خصوصاً جدید مغربی ادب کی تمام اہم کتابیں۔ اس لائبریری کا خاصا بڑا حصہ ہندوستان میں رہ گیا۔ ویسے ان کے کراچی والے مکان میں جو لائبریری ہے وہ بھی خاصی بڑی لائبریری ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی شادی کم سنی میں ہوگئی جو ان کے حق میں کئی لحاظ سے مفید ثابت ہوئی۔ میں انھیں اس بات پر بہت اُکساتا رہتا تھا کہ وہ ادبی سرگرمیوں کی طرف واپس آئیں اور خصوصاً تین چار کام ضرور کر ڈالیں جن کے لیے وہ اردو ادب کے بہت سے دوسرے نقادوں سے زیادہ موزوں ہیں۔ ان میں سے ایک کام تو یہ ہے کہ وہ اردو کے آٹھ دس بہترین افسانہ نگاروں کا تفصیلی مطالعہ لکھیں۔ دوسرے اردو کے آٹھ دس منتخب ناول نگاروں پر ایک تنقیدی کتاب لکھیں۔ تیسرے وہ سعادت حسن منٹو پر اپنی کتاب مکمل کریں۔ چوتھے گزشتہ پچیس سال کے اہم ترین مغربی ناول نگاروں سے اردو ادب کو روشناس کرائیں۔ پچھلے دس بارہ سال کے اندر ان کے کم لکھنے یا نہ لکھنے

کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ ان کی لکھی ہوئی چیزوں اور مجموعوں کی طباعت کے لیے پبلشرز مل سکے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اس کی فکر نہ کریں کہ آپ کی کتابوں کے لیے کوئی پبلشر مل رہا ہے یا نہیں۔ آج کل تقریباً ہر کتاب پہلے رسالوں میں چھپ جاتی ہے۔ اس کے بعد کتابی شکل میں۔ آپ بھی لکھتی جائیں اور رسالوں میں شائع کرتی جائیں۔ میں نے یہ سب کچھ کہنے کے بعد ان سے وعدہ تک لیا کہ وہ صحت یاب ہوتے ہی ادبی کام شروع کر دیں گی۔

ممتاز شیریں سے میری یہ ملاقات ان سے میری دو تین بہترین ملاقاتوں میں سے تھی اور ایک لحاظ سے ان سے میری یہ آخری ملاقات بھی تھی کیونکہ اگرچہ اس ملاقات کے بعد ان کی وفات سے ایک روز قبل تک میں کئی مرتبہ ان کی عیادت کے لیے گیا، لیکن میں نے ان کی حالت کو خراب سے خراب تر پایا اور مجھے مناسب معلوم نہ ہوا کہ میں انھیں گفتگو کی زحمت دوں۔ ان کے کمرے میں شاہین صاحب سے دو دو گھنٹے تک گفتگو ہوتی۔ میں انھیں صرف دیکھ کر اور شاہین صاحب سے ان کی حالت پوچھ کر واپس آجاتا۔ ان کی حالت کی روز افزوں خرابی کے باوجود مجھے آخر تک یہ اندازہ نہ ہو سکا یا یوں سمجھیے کہ یہ اندیشہ میرے ذہن میں راہ نہ پا سکا کہ وہ بہت جلد اور اچانک دنیا کو خیر باد کہہ دیں گی۔

ان کا انتقال اتوار کے دن ۱۱ مارچ کی صبح کو سات اور ساڑھے سات بجے کے درمیان ہوا۔ سنیچر کی رات کے آٹھ بجے سے دس بجے تک میں اسپتال میں شاہین صاحب کے پاس بیٹھا رہا۔ ادھر کئی دن سے وہ دن رات ممتاز شیریں کی تیمارداری میں مصروف تھے۔ رات کے وقت سوتے بھی وہیں تھے۔ یہ بات مجھے حال میں معلوم ہوئی کہ شاہین صاحب کے ایسا کرنے میں ممتاز شیریں کے معالج کی احتیاطی کوششوں کو بھی دخل تھا۔ معالج کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ممتاز شیریں کے جسم و جاں کا رشتہ کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ اس لیے ایک طرف تو انھوں نے شاہین صاحب کے علم کے بغیر ان کے افسرِ اعلیٰ سے سفارش کی کہ انھیں بیوی کی تیمارداری

کے لیے چھٹی دی جائے اور دوسری طرف اُنھوں نے شاہین صاحب کو اس بہانے اسپتال میں ہر وقت موجود رہنے پر آمادہ کیا کہ ان دنوں اسپتال میں نرس وریس کی کمی ہے اور ممتاز شیریں کی بڑھتی ہوئی نقاہت کے پیشِ نظر ان کے پاس آپ کی ہمہ وقت موجودگی ضروری ہے۔

جب میں نے سنیچر کی شام کو شاہین صاحب سے پوچھا۔ آج کیا حال ہے؟ کچھ بہتر ہیں؟ تو انھوں نے کہا فی الحال یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بہتر ہیں یا نہیں۔ ان کے مرض میں پیچیدگی پیدا ہو رہی ہے اور علاج میں وقت لگے گا۔

مجھے ممتاز شیریں کے امراض شروع سے پیچیدہ معلوم ہو رہے تھے اور یقین تھا کہ ان کا علاج وقت طلب ہے لیکن سنیچر کی شام کو بھی میرے ذہن میں ان کی طرف سے کوئی مایوسی نہ تھی۔ میں نے انھیں شاہین صاحب سے گفتگو کرتے دیکھا۔ اُنھوں نے پوچھا ڈاکٹر سرفراز نے کیا کہا ہے۔ شاہین صاحب نے جواب میں کئی باتیں انگریزی میں کہیں۔ ممتاز شیریں کے ہوش و حواس اس حد تک بجا تھے کہ وہ ساری باتیں سمجھ رہی تھیں۔

دُوسرے دن اتوار کی صبح کو تقریباً نو سوا نو بجے میں ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے مکان کی بالائی منزل میں شاہین صاحب ہی کے عنایت کردہ ٹائمز لندن کے پُرانے لٹریری سپلیمنٹ کے انبار کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ کسی صاحب کی کار کے آنے کی آواز محسوس ہوئی۔ میری پانچ سالہ بچی رخشی نے آ کر خبر دی کہ ابو آپ کے دوست آئے ہیں۔ زینے سے اُتر کر شاہین صاحب کو دیکھتے ہی دِل دھک سے ہو گیا۔ بدترین قسم کے اندیشے ذہن میں بجلی کی طرح چمک گئے۔ اُنھوں نے پہلے تو خندہ پیشانی کے ساتھ پوچھا کیسے کیا کر رہے ہیں؟ اور اس کے بعد یہ کہہ کر کہ آج صبح شیریں کا انتقال ہو گیا آبدیدہ ہو گئے۔ یہ خبر سن کر میں سکتے میں آ گیا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کے بازو تھام لیے۔ ایک آدھ منٹ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ پھر اُنھوں نے بتایا کہ شیریں

سے نے صبح کے سات بجے نرس کے ہاتھوں TABLETS کھائی تھیں۔ اس کے بعد میں باتھ روم گیا کہ ذرا ہاتھ منہ دھولوں تاکہ نیند کا اثر جاتا رہے کیونکہ کل رات تقریباً ہر آدھے گھنٹے یا ایک گھنٹے پر میں انھیں پانی یا دوا یا ہورلکس وغیرہ دیتا رہا۔ خیال یہ تھا کہ شیریں کو چائے پلا کر کچھ دیر کے لیے گھر جاؤں گا، لیکن جب میں چائے کی پیالی لے کر شیریں کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ اب وہ نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے سوا سات اور ساڑھے سات بجے کے درمیان کسی وقت وہ انتقال کر گئیں۔

ممتاز شیریں کا مرض الموت کینسر تھا۔ ان کے معالج کو ان کی وفات سے صرف آٹھ دس دن پہلے جب وہ ڈائریا میں مبتلا تھیں اُن پر کینسر کا شبہ ہوا بلکہ یہ بھی اندازہ ہوا کہ آنتوں کے اس کینسر کا اثر دماغ تک جا پہنچا ہے۔ ممتاز شیریں کو آخر وقت تک اس کا علم نہ ہونے دیا گیا۔ شاہین صاحب کو بھی ان کی وفات سے پہلے واضح طور پر نہیں بتایا گیا کہ ممتاز شیریں اتنے جان لیوا مرض میں مبتلا ہیں لیکن ان کی وفات سے تین چار دن پہلے سے ان کا ذہن بدترین اندیشوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ اُنھوں نے ڈاکٹر سرفراز سے کہا بھی تھا کہ اب صحیح صورتِ حال بتا دیں تاکہ دونوں بیٹوں پرویز اور گلریز کو جو لندن میں ہیں مطلع کر دیا جائے۔

سنیچر کی شام کو ممتاز شیریں نے پوچھا میں کہاں ہوں۔ یہ کمرہ بہت تنگ معلوم ہو رہا ہے۔ شاہین صاحب نے جواب دیا۔ بی بی آپ جہاں تھیں وہیں ہیں اور یہ کمرہ تو بہت کشادہ ہے۔ پھر اسی شام کے سات آٹھ بجے کے درمیان عالمِ خواب میں ممتاز شیریں نے کہا۔ ہم سرحد کا سفر کر رہے ہیں، نئی نئی چیزیں نظر آ رہی ہیں۔ شاہین صاحب نے اس جملے کی وضاحت چاہی اور پوچھا۔ کون سی سرحد؟ پشاور؟ افغانستان؟ لیکن زیادہ سوال کرنا مناسب نہ سمجھ کر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

دسمبر ۱۹۷۲ء کے وسط سے جب ممتاز شیریں کی بائیں ٹانگ سُن ہونے لگی تھی انھیں صرف یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں وہ چلنے پھرنے سے معذور مریضہ بن کر نہ رہ جائیں۔ ان کے چھوٹے بیٹے گلریز مارچ میں لندن سے آنے والے تھے۔

وہ اس خیال سے پریشان ہوتی تھیں کہ جو بیٹا ساڑھے چھ سال بعد ان سے ملنے آرہا ہے وہ انھیں بیمار اور معذور پا کر کیسا محسوس کرے گا۔ ساڑھے چھ سال پہلے اپنے بیٹوں سے ان کی آخری ملاقات انقرہ میں ہوئی تھی جہاں سے وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ یورپ کے متعدد تفریحی مقامات پر گئی تھیں۔ اب کے بھی کراچی، لاہور اور پشاور وغیرہ جانے کا پروگرام تھا۔ لیکن سوال یہ تھا۔ کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟ میں نے پولی کلینک میں انھیں کئی مرتبہ یقین دلایا کہ آپ گلریز کے آنے سے پہلے صحت یاب ہو جائیں گی۔ اس لیے گھبرائیں نہیں اور شفایابی کے لیے قوتِ ارادی سے بھی کام لیں۔ اس پر انھوں نے ایک دن مجھے بتایا کہ شارعہ بھی کہہ رہی تھیں کہ آپ نے اپنے افسانہ 'کفارہ' میں جس قوتِ ارادی کا ثبوت دیا ہے اس سے کام نہیں لے رہی ہیں۔ یہ کہتے وقت ان کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسرت نظر آئی جیسے کہ انھیں اس خیال سے خوشی ہو رہی ہو کہ چلو اب کی بار زندگی اور موت کی کشمکش میں موت پر فتح پائی ہے۔

جو دکھ ممتاز شیریں اپنے ساتھ لے گئیں ان میں سے ایک دکھ اپنے دونوں بیٹوں سے نہ مل سکنے کا ضرور ہوگا۔ اولاد میں ان کے کل دو ہی بیٹے ہیں جو آٹھ نو سال سے لندن میں ہیں۔ پرویز اور گلریز۔ گلریز کو مارچ میں یہاں آنا تھا سو آئے لیکن ماں کی وفات کے بعد چھ ٹھے دن یہاں پہنچے۔

ممتاز شیریں نہایت خوش مزاج، خوش اخلاق، خاموش طبع اور گوشہ نشین خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے وسیع مطالعے اور گہری علمیت کا لوہا بہت ہی کم عمری میں منوالیا تھا۔ لیکن ان کے دوسرے ملنے والوں کی طرح میرا بھی تجربہ اور تاثر یہی ہے کہ ان میں علمی رعونت نام کو نہ تھی۔ وہ ادب میں یقیناً تند جبیں نقاد (HIGH BROW CRITIC) تھیں جنھیں اپنی رایوں پر نہ صرف اعتماد تھا بلکہ اصرار بھی۔ لیکن ذاتی زندگی میں وہ نہایت منکسر المزاج، سیدھی سادھی سادہ دل عورت تھیں۔ نہ ان کے رہنے سہنے کے طریقے میں نمود و نمائش

تھی نہ ان کی بات چیت میں خودستائی اور پندار۔ ان میں وہ کسرِ نفسی اور خود فراموشی (EFFACEMENT SELF) تھی جس کی توقع ان کی تحریروں سے نہیں ہوتی۔ اپنی تحریروں میں (SELF ASSERTIVE) اور اپنی ذاتی زندگی میں (SELF EFFACING) ہونے کی جیسی مثال مجھے ان کی ذات میں نظر آئی ویسی کسی اور کی شخصیت میں نظر نہ آسکی۔

شاہین صاحب میسور کے ایک نہایت دولت مند خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ممتاز شیریں بھی ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ پاکستان میں شاہین صاحب زندگی کے متعدد نشیب و فراز سے گذرے لیکن نشیب سے گذرتے وقت بھی اُنھوں نے اپنی سرفرازی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ کراچی میں ان کا گھر پاکستان کے بہترین ادیبوں، نقادوں اور دانشوروں کا مرکز تھا۔ اعلیٰ تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں وہ کئی سال بیرونی ممالک میں رہے۔ ممتاز شیریں نے بھی آکسفورڈ یونیورسٹی سے انگریزی ادب کا ایک کورس کیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود دونوں میاں بیوی اُن معنوں میں (SOPHISTICATED) کبھی نہ بنے جن معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ میں نے دونوں کے اندر ایک مشرقی سادگی اور بے تکلفی پائی۔ ساتھ ہی وہ رکھ رکھاؤ بھی جو بے تکلفی کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔

ایک مرتبہ ممتاز شیریں نے مجھے بینگ کوک کے زمانۂ قیام کی کچھ تصویریں دکھائیں۔ ایک تصویر میں وہ کچھ خواتین کے ساتھ بیٹھی سگریٹ پیتی نظر آئیں۔ میں نے پوچھا کیا آپ نے سگریٹ نوشی ترک کر دی۔ کہنے لگیں۔ ہاں پاکستانی ماحول میں عورت کی سگریٹ نوشی کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

ایک دفعہ جاڑوں کے آغاز میں شام کے وقت شاہین صاحب ممتاز شیریں کے ساتھ کسی دوست کے یہاں جا رہے تھے۔ اتفاقاً میں ان کے یہاں پہنچ گیا۔ اُنھوں نے مجھے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ راستے میں ممتاز شیریں نے اپنے بیگ سے نہایت خوبصورت دستانے جو غالباً یورپ میں خریدے گئے

نتھے نکال کر پہن لیے۔ شاہین صاحب نے کہا ابھی سردی اتنی نہیں ہے۔ یہ چیز (CONSPICUOUS) ہو جائے گی۔ ممتاز شیریں نے فوراً دستانے اتار کر بیگ میں رکھ دیئے۔ شاہین صاحب کی موجودگی میں وہ مجھے کبھی ادیب، نقاد اور فن کار معلوم ہی نہیں ہوئیں۔ ان کی موجودگی میں ممتاز شیریں اپنے بہترین معنوں میں ایک مشرقی بیوی ہی نظر آتی تھیں۔ وہ شاہین صاحب کی خوشی اور خوشنودی کا بہت لحاظ رکھتی تھیں۔ کئی سال کی خاموشی اور گوشہ گیری کے بعد پچھلے سال اُنھوں نے ریڈیو پاکستان پنڈی کا ایک پروگرام قبول کیا جس میں ان کا انٹرویو لیا گیا تھا۔ جب وہ اس پروگرام کے لیے ریڈیو اسٹیشن گئیں تو اپنا قلم وہیں بھول آئیں۔ ایک دن اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ریڈیو اسٹیشن جاتے رہتے ہیں۔ اب کے جائیں تو فلاں صاحب سے کہئے گا کہ ان کی میز پر میرا قلم رہ گیا تھا۔ میں نے کہا آج کل تو میرا جانا نہیں ہوتا میں فون پہ کہہ دوں گا۔ اُنھوں نے کہا خیر آپ فون ہی پر بات کر کے میرا قلم منگوا دیں۔ ویسے میں شاہین صاحب سے بھی ریڈیو والوں کو کہلوا سکتی تھی۔ لیکن چونکہ قلم بہت اچھا ہے، اگر اس وقت تک ضائع ہو چکا ہے تو شاہین صاحب کو بڑی کوفت ہو گی۔ اسی لیے میں ان سے اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے اُن کے قلم کے سلسلے میں کئی مرتبہ ریڈیو والوں کو فون کیا مگر بے سود۔ صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان میں کوئی چیز کہیں گر جائے یا چھوٹ جائے پھر اس کا ملنا ناممکنات میں سے ہے۔

ممتاز شیریں نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ شاہین صاحب کو اپنا بہترین نقاد مانا ہے۔ پاکستان آنے اور پاکستان میں کچھ عرصے تک 'نیا دور' کو جاری رکھنے کے بعد شاہین صاحب نے نہ تو صرف اردو میں لکھنا لکھانا ترک کر دیا بلکہ وہ ادبیات سے زیادہ سیاسیات اور عمرانیات سے دلچسپی لینے لگے۔ نتیجتاً تاریخ، سیاسیات، عمرانیات اور حالاتِ حاضرہ پر ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ لیکن چونکہ ادب میں وہ ذوقِ صحیح کے مالک ہیں اور ایک زمانے تک اُنھوں نے مغربی ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے اس لیے ممتاز شیریں ادبیات میں ان سے زیادہ وسیع المطالعہ

ہونے کے باوجود ان کی رایوں کو ہمیشہ انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ممتاز شیریں شاہین صاحب کو نہ صرف شریکِ حیات تصور کرتی تھیں بلکہ اپنا ذہنی مشیر و مرشد بھی۔

پاکستان اور اسلام کی طرف ممتاز شیریں کا ذہنی اور جذباتی رویہ وہی تھا جو شاہین صاحب کا ہے۔ شاہین صاحب پانچ وقت کی نماز پڑھنے والے روایتی مسلمان نہ سہی لیکن مزاجاً مذہبی واقع ہوئے ہیں اور اسلام کے پرستاروں میں سے ہیں۔ وہ اسلامی عقائد کی صداقت اور پاکستان کی ضرورت اور بقا کے دل سے قائل رہے ہیں۔ ممتاز شیریں بھی جب پاکستان آئیں تو اس نئے ملک کو ذہنی اور جذباتی طور پر قبول کر کے آئیں اور اردو ادب میں پاکستانی قومیت کا شعور پیدا کرنے کی شعوری کوشش کرتی رہیں۔ مذہب سے وابستگی کے معاملے میں عورتیں مردوں سے دو چار ہاتھ آگے ہی ہوتی ہیں اس لیے اسلام سے ممتاز شیریں کی شیفتگی صرف عقیدے کی حد تک نہ تھی بلکہ وہ نماز بھی پڑھتی تھیں اور روزے بھی رکھتی تھیں۔ ان کے افسانہ 'کفارہ' میں ان کے مذہبی شعور کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

ممتاز شیریں نے تقریباً دس بارہ سال سے باقاعدگی کے ساتھ لکھنا ترک کر دیا تھا۔ لیکن ان کے مطالعے کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا گو مطالعے میں بھی وہ انہماک باقی نہیں رہ گیا تھا جو سنجیدگی اور باقاعدگی سے لکھنے والوں کے مطالعے میں ہوتا ہے۔ لکھنے کی خاطر مطالعہ کرنا کچھ اور ہے اور ذہنی تفریح کے لیے مطالعہ کرنا کچھ اور۔ لکھنے کے لیے مطالعہ کرنا ایک غیر معمولی ذہنی ریاضت ہے۔ گزشتہ دس بارہ سال سے ممتاز شیریں نے یہ ریاضت ترک کر دی تھی۔ وہ صرف اپنی ذہنی تفریح کے لیے کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی تھیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ کینسر کے ہاتھوں زندگی سے محروم ہو جانے والی ممتاز شیریں نے جو آخری ادبی ناول پڑھا اس کا نام (THE CANCER WARD) ہے جس پر اس کے روسی مصنف (ALEKSANDER SOLZHENITSYN) کو غالباً ۱۹۷۰ء میں نوبل پرائز ملا تھا۔

پولی کلینک میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے لارنس ڈرل کا ناول CLEA پڑھنا چاہا لیکن صحت کی روز افزوں خرابی کے باعث اسے نہ پڑھ سکیں۔ ایک کتاب جسے اُنھوں نے گھر پر پڑھنا شروع کیا تھا اور جسے پولی کلینک میں ختم کیا مختار مسعود کی "آواز دوست" ہے۔ معلوم نہیں اس کتاب کے بارے میں ان کی رائے کیا تھی لیکن جنوری ۱۹۷۳ء میں جب یہ کتاب چھپی تو اُنھوں نے اس کتاب کو پڑھنے کا بیتابانہ اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے مجھ سے یہ کتاب مانگی۔ میں نے ان کو اپنا نسخہ دے دیا تھا۔ بعد میں اُنھوں نے اپنے لیے بازار سے ایک نسخہ منگوالیا تھا۔ پولی کلینک میں ایک دن میں نے ان کے سرہانے انگریزی کے دو ایک DETECTIVE ناول دیکھے اور پوچھا کیا آپ کو (DETECTIVE) ناولوں سے بھی دلچسپی ہے۔ جب اُنھوں نے عذر خواہانہ اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ (LIGHT READING) کے لیے نثار عزیز یہ ناول دے گئی ہیں تو میں نے کہا۔ آپ انھیں ضرور پڑھیں اور اس معاملے میں APOLOGETIC ہونے کی ضرورت محسوس نہ کریں جاسوسی ناول تو ایک ایسی چیز ہے جس سے دُنیا کی عظیم ترین شخصیتیں بھی دلچسپی لیتی رہی ہیں۔ برٹرنڈ رسل اور ٹی ایس ایلیٹ جیسے لوگ بھی کبھی کبھار جاسوسی ناول پڑھ لیا کرتے تھے۔

یہ مضمون جو ایک تعزیتی جلسے کے لیے لکھا گیا ہے اسے ممتاز شیریں کا شخصی خاکہ یا تنقیدی مطالعہ بنانا ممکن نہ تھا نہ مناسب شخصی خاکے اور تنقیدی مطالعے کا حق ادا کرنے کے لیے زمانی فاصلے کی شدید ضرورت ہے۔ افسانہ نگاری اور تنقید نگاری میں ان کا جو مرتبہ ہے وہ ایک الگ مضمون چاہتا ہے اور وہ مضمون مجھ پر یوں بھی قرض رہے گا کہ ایک مرتبہ میں نے ممتاز شیریں سے وعدہ کیا تھا کہ ان پر مضمون لکھوں گا۔ وعدے کی تقریب یہ تھی کہ میری ان کی گفتگو کے دوران ان کی تحریروں کا ذکر چل نکلا۔ اپنی تحریروں سے میری دیرینہ دلچسپی کے پیشِ نظر انھوں نے کہا۔ آپ کو تو مجھ پر کچھ لکھنا چاہیئے۔ میں نے جواب میں کہا "نہ صرف مجھے بلکہ مجھ سے بہتر لکھنے والوں کو بھی آپ پر لکھنا چاہیئے۔ آپ کا کام اور آپ کی کارکردگی

اس قابل ہے کہ آپ پر نہ صرف مضامین لکھے جائیں بلکہ کتابیں بھی ۔ مجھے اپنے حالات کی طرف سے قدرے سکون ہو تو میں آپ پر ضرور لکھوں گا ۔

جس وقت ممتاز شیریں سے یہ باتیں ہو رہی تھیں مجھے پروفیسر احمد علی سے اپنی پہلی ملاقات یاد آ رہی تھی ۔ نومبر ۱۹۶۹ء میں جب میں ان سے کراچی میں ملا اور گفتگو کے دوران میں نے ان سے شکایت کی کہ آپ نے اردو ادب کو اپنی تحریروں سے بالکل محروم کر رکھا ہے تو انھوں نے تلخ لہجے میں کہا میں کیوں لکھوں جب مجھے اردو کا ادیب ہی نہیں مانا جاتا ۔ میں نے کہا ۔ آپ کو اردو کا ادیب ماننے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے ۔ کہنے لگے اگر میں اردو کا ادیب مانا جاتا تو لوگ مجھ پر مضامین لکھتے میری خدمات کا اعتراف کرتے ۔ گزشتہ بیس بائیس سال کے اندر مجھ پر مشکل سے دو تین مضمون لکھے گئے ہوں گے اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے بڑے اچانک انداز میں پوچھا ۔ اور خود آپ نے مجھ پر کب لکھا ؟ میں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ۔ آپ پر میرا لکھنا کیا اہمیت رکھتا ہے ، آپ جیسے ادیب پر ان لوگوں کو لکھنا چاہیے جن کی اہمیت مسلم ہے یعنی آپ پر آپ کے اہم ترین معاصرین کو لکھنا چاہیے تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ اردو ادب میں مسلمہ حیثیت والے معاصرین پر بہت کم لکھتے ہیں ۔

پروفیسر احمد علی سے اس گفتگو کے بعد میری زندگی میں یہ دوسرا موقع تھا کہ اردو کی ایک نہایت ممتاز ادیبہ ممتاز شیریں ، تلخ لہجے میں نہ سہی اپنی نسوانی نرمی کے ساتھ اس خواہش کا اظہار کر رہی تھیں کہ مجھے ان پر لکھنا چاہیے ۔ ممکن ہے بعض لوگ پروفیسر احمد علی اور ممتاز شیریں کی اس خواہش کو ان کے شایانِ شان نہ سمجھیں لیکن میں ان دونوں کی اس خواہش پر جس قدر غور کرتا ہوں اسی قدر مجھے ان کی یہ خواہش فطری اور حق بجانب محسوس ہوتی ہے ۔ اس خواہش کے پیچھے شہرت کی ہوس کو کوئی دخل نہیں کیونکہ جتنی شہرت پروفیسر احمد علی اور ممتاز شیریں کو میسر آئی اس سے زیادہ اردو کے کسی ادیب یا فن کار کو کیا میسر آئے گی ۔ قائداعظم یا قائدِ ملت کی طرح ان کے نام بچے بچے کی زبان پر آنے سے رہے ۔ دراصل اپنے بارے میں

اپنے چھوٹے بڑے معاصرین کے مضامین کی آرزو اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ ذرا دیکھیں تو سہی ہماری تخلیقی کارکردگی پر ہمارے چھوٹے بڑے معاصرین کا ردِ عمل کیا ہے اور ان کے نزدیک ہماری کاوشوں کی قدر و قیمت کیا ہے سو یہی بات ہمارے ادیبوں اور فن کاروں کو معلوم نہیں ہو پاتی۔ لکھنے والوں کو پڑھنے والوں کے REACTION اور EVALUATION کا معلوم ہونا ان کی کاوشوں کا کم سے کم صلہ ہے اور افسوس ہے کہ ہمارے لکھنے والوں کو اتنا صلہ بھی نہیں ملتا یا اس حد تک نہیں ملتا جس حد تک کہ ملنا چاہیے۔ کسی پروفیسر احمد علی یا کسی ممتاز شیریں سے ہم یہ شکایت تو کر بیٹھتے ہیں کہ آپ نے لکھنا ترک کر دیا ہے لیکن ہم اس بات پر سنجیدگی سے کبھی غور نہیں کرتے کہ آخر اس صورتِ حال کے اسباب کیا ہیں۔ جس معاشرے میں ممتاز شیریں جیسی قدرِ اوّل کی لکھنے والی کو اپنی کتاب معیار کی طباعت کے لیے دس سال انتظار کرنا پڑے اور کئی کتابوں کی طباعت کے لیے سرے سے کوئی ناشر نہ ملے اور کسی کتاب کا معاوضہ مِل جانے کے باوجود وہ کتاب شائع نہ ہو سکے تو ایسے معاشرے میں لکھنے والوں کو لکھتے رہنے کی تحریک کیوں کر ہو۔

ممتاز شیریں اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں زیادہ سرگرمِ عمل نہ ہونے کے باوجود کئی مسودات چھوڑ گئی ہیں جن میں ایملی برونٹی اور ہیبسٹر ناک سے متعلق دو کتابیں انگریزی میں ہیں۔ منٹو پر ان کی کتاب نا تمام ہونے کے باوجود اس وقت تک منٹو کا سب سے زیادہ تفصیلی اور تنقیدی مطالعہ ہے۔ انھوں نے اپنے بہترین افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جو ایک مقدمے کے ساتھ مرتب شکل میں موجود ہے۔ ان کے مسودات میں ایک نامکمل خود نوشت بھی ملی ہے جو پندرہ بیس صفحات پر مشتمل ہے اور جسے انھوں نے ۱۹۶۲ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے متعلق بہترین افسانوں کا ایک مجموعہ انھوں نے مرتب کیا تھا اور جس پر ایک طویل مقدمہ بھی لکھا تھا اور یہ مجموعہ آج تک جمیل الدین عالی کی تحویل میں طباعت سے محروم پڑا ہے۔ ممتاز شیریں کی دو چیزیں ایسی ہیں جو اگرچہ ان کی زندگی میں شائع ہوئیں

مگر ان کی طباعت عام طباعت کے برابر ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں شائع ہونے کے بعد کہیں DUMP کر دی گئیں۔ ان میں سے ایک نوا شین بک کے ایک ناول کا اردو ترجمہ "درشہوار" ہے جس کے مقدمے میں انھوں نے امریکی ناول کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ دوسرے منتخب امریکی افسانوں کا اردو ترجمہ ہے جس پر ان کا ایک طویل مقدمہ ہے جو بڑی محنت سے لکھا گیا تھا۔ ممتاز شیریں نے دُنیا کی مختلف زبانوں کے بہترین افسانوں کا اردو ترجمہ خاصی تعداد میں شائع کیا ہے۔ ان ترجموں سے ایک اچھی کتاب بن سکتی ہے۔ رسالوں میں ان کے بکھرے ہوئے مضامین ہیں جن سے ایک مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ غرض کہ دُنیا سے جاتے جاتے بھی وہ ہمارے ادب کو بہت کچھ دے گئی ہیں۔ اگر ہمارا معاشرہ واقعی ان کا قدرداں ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ اب بھی ان کی تخلیقات کو کتابی شکل میں محفوظ کرنے کا بندوبست کرے۔

میرے نزدیک ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ برِصغیر کی تین ممتاز ترین لکھنے والیوں میں سے ہیں جن میں سے باقی دو عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر ہیں۔ ان کی تنقیدی سرگرمیوں کا تعلق افسانے اور ناول سے رہا اور اس معاملے میں وسعتِ مطالعہ فنی ادراک اور تنقیدی بصیرت کے اعتبار سے ان کی جگہ حسن عسکری، عزیز احمد اور ڈاکٹر احسن فاروقی کی صف میں محفوظ رہے گی۔

اپریل ۱۹۷۳ء

زیڈ اے بخاری ـــــ چند یادیں چند باتیں

ہر آدمی ایک شخص تو ضرور ہوتا ہے لیکن ہر شخص ایک شخصیت نہیں ہوا کرتا۔ بخاری صاحب کو دیکھ کر اور ان سے مل کر جو بات سب سے پہلے ذہن میں آتی تھی وہ یہی تھی کہ یہ شخص کم اور شخصیت زیادہ ہیں۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ محض ایک شخصیت نہیں کئی شخصیتوں کا مجموعہ تھے اور اس لحاظ سے "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کے مصداق۔

جوان رعنا تو میں نے بہت دیکھے اور دیکھتا ہی رہتا ہوں لیکن مجھے بخاری صاحب سے بہتر اور برتر پیرِ رعنا دیکھنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا۔

بخاری صاحب سے میری پہلی ملاقات اگست ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ہاں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں میں ڈھاکا یونیورسٹی میں بی اے کا طالب علم تھا۔ اس وقت تک میں اپنے ادبی ذوق کی بدولت پطرس بخاری کے نام اور کام سے واقف تھا لیکن زیڈ اے بخاری کے نام تک سے آشنا نہ تھا۔

ان دنوں میری اکثر شامیں شادانی صاحب کے ہاں گزرتی تھیں۔ ایک شام میں حسب معمول شادانی صاحب کے ہاں بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک شاندار کار ان کی گیٹ پر آکر رکی۔ ایک لمبے تڑنگے وجیہہ صورت صاحب بہادر قسم کے صاحب سفید ہاف شرٹ اور سفید پتلون میں ملبوس، گیٹ کھول کر برآمدے میں آ گئے۔ ...

بڑی بے تکلفی سے شادانی صاحب سے بغلگیر ہونے کے بعد چوکی پر بیٹھ کر ان سے ایسی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے جس کا مظاہرہ شادانی صاحب کے ڈھاکے کے احباب کی طرف سے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ بخاری صاحب کی بے تکلفی میں کسی قسم کی ناشائستگی کا کوئی پہلو تھا بلکہ یہ کہ میں نے جس حد تک انھیں شادانی صاحب سے بے تکلف پایا اتنا شادانی صاحب کے کسی اور دوست کو بے تکلف ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ شادانی صاحب خوش اخلاق، شگفتہ مزاج اور ظریف الطبع ہونے کے باوجود لیے دیئے رہنے والے آدمی تھے۔ وہ خوش طبعی اور بے تکلفی میں ایک خاص حد سے نہ خود آگے بڑھتے تھے نہ دوسروں کو آگے بڑھنے دیتے تھے۔

اس شام بخاری صاحب تقریباً ایک گھنٹے تک مختلف موضوعات پر شادانی صاحب سے ہنس بول کر کچھ ان کا کلام سن کر اور اس سے زیادہ اپنا کلام سنا کر رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد شادانی صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ سیّد ذوالفقار علی بخاری تھے جو پطرس بخاری کے چھوٹے بھائی ہیں اور میرے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔

ریڈیو پاکستان کے کنٹرولر کی حیثیت سے ڈھاکے میں بخاری صاحب کی یہ پہلی آمد تھی۔ اس کے بعد وہ ہر سال، سال بھر میں دو ایک مرتبہ ڈھاکے ضرور آتے اور جب بھی آتے اپنی اکثر شامیں شادانی صاحب کے یہاں گزارتے۔

پہلی ہی ملاقات میں بخاری صاحب کی شخصی وجاہت، ان کی خوش آوازی اور خوش گفتاری اور ان کے کلام کی شستگی اور برجستگی مجھ پر ایسا جادو کر گئی جس کے اثر سے میں کبھی نکل نہ سکا۔

بخاری صاحب کی شخصی وجاہت میں ان کے سر کے بالوں اور ان کی شخصیت کو پُر وقار بنانے میں ان کے گھنے ابروؤں کو جو دخل تھا وہ دیکھے بغیر سمجھ

میں نہیں آسکتا۔ میں نے اتنے خوب صورت سفید بال اور اتنی گھنی بھنویں آج تک کسی اور شخصیت میں نہیں دیکھیں اور ان کی آواز کا کیا پوچھنا۔ ان کی زبان سے معمولی سے معمولی جملہ کان میں رس گھول دیتا تھا۔ اُنھوں نے اپنا کلام تحت اللفظ بھی سنایا اور ترنم کے ساتھ بھی۔ دونوں میں وہ دلکشی کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل۔ گفتگو میں جملے اردو کے ہوں یا انگریزی کے، دونوں اتنے نرشتے ترشائے کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار کہ وہ اردو بہتر جانتے ہیں یا انگریزی، بہ اہتمام اپنی جگہ پر کہ اردو بولتے وقت انگریزی لہجے کو راہ نہ دیتے اور انگریزی گفتگو پر اردو لہجے کا عکس نہ پڑنے دیتے۔ اپنی افسرانہ عظمت کے باوجود ہنسنے ہنسانے میں بے ساختگی کا ثبوت دیتے۔ وہ نہ صرف اپنی ذات سے مجسم زندگی تھے بلکہ اپنے اردگرد کے پورے ماحول کو زندگی سے برقا دینے والے بھی۔

شادانی صاحب کے ہاں پہلی مرتبہ بخاری صاحب کی غزلیں سُن کر میں حیران رہ گیا کہ اتنا منفرد اور خوش فکر شاعر پاکستان اور ہندوستان کے اردو شاعروں کی فہرست میں کیوں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس دن میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ہر شاعر کا ممتاز ہونا اور ہر ممتاز شاعر کا مشہور ہونا ضروری نہیں۔ بخاری صاحب کے جانے کے بعد میں دیر تک شادانی صاحب سے بخاری صاحب کے کلام کی تعریف کرتا رہا۔ وہ میرے تعریف آمیز کلمات صبر کے ساتھ سُنتے رہے۔ میں دل میں یہ بھی سوچتا رہا کہ آج سے پہلے خود شادانی صاحب نے مجھ سے بخاری صاحب کی شاعری کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ غور کرنے پر پتا چلا کہ شعر و سخن بالخصوص غزل کی شاعری کے معاملے میں اُنھوں نے اپنی پسند اور پرکھ کا جو معیار قائم کر لیا تھا اس پر شروع میں یا تو پروفیسر اختر انصاری پورے اُترے یا بعد میں حبیب جالبؔ اور ان دونوں سے زیادہ وہ خود۔ اوروں کے لیے اس معیار پر پورا اترنے کی گنجائش تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ شادانی صاحب کے یہاں

بخاری صاحب سے میری جو پہلی ملاقات ہوئی، اگرچہ اس وقت تک میں بخاری صاحب کے نام سے بالکل ناآشنا تھا لیکن میرے ناآشنا ہونے کے معنی ان کے غیر معروف یا گمنام ہونے کے ہرگز نہ تھے۔ اس زمانے تک وہ شہرت، عزت اور اہمیت کے نہ جانے کتنے مرحلے طے کر چکے تھے۔ وہ متحدہ ہندوستان میں آواز کے شہنشاہ تسلیم کیے جا چکے تھے۔ ایک ریڈیو ڈرامے میں بیک وقت سات آٹھ مختلف آوازوں میں اداکاری اور صداکاری کا کمال دکھا چکے تھے اور دکھا سکتے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن سے آواز کو نشر کرنے والی مشین کا خفیف ترین نقص ان کے احساس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں بی بی سی لندن میں بڑے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ لندن کے دوران قیام میں جارج برنارڈ شا اور اس قبیل کی دوسری عظیم اور غیر فانی ہستیوں سے ان کے سرکاری واسطے پڑ چکے تھے اور جیسا کہ انھوں نے اپنی سرگزشت (جو اردو نثر کی بہترین کتابوں میں شمار کی جا سکتی ہے) میں لکھا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ جیسے عہد آفریں شاعر اور نقاد سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے تھے۔ ان سب پر طرہ یہ کہ انھیں بی بی سی لندن کی ملازمت کے دوران بیسویں صدی کے سب سے بڑے انگریز طنز نگار جارج اورول (جسے ذاتی طور پر میں سوئفٹ کے بعد انگریزی ادب کا دوسرا سب سے بڑا طنز نگار تصور کرتا ہوں) کے افسر اعلیٰ رہنے کا شرف حاصل رہ چکا تھا۔ خود ہندوستان مثلاً بمبئی اور دہلی وغیرہ میں وہ آل انڈیا ریڈیو کے ریجنل ڈائرکٹر رہ چکے تھے۔ اس حیثیت سے انھوں نے ہندوستان کے کتنے ہی ریڈیو اداکاروں اور موسیقاروں کو اپنی تربیت اور حوصلہ افزائی سے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ ایک سخن سنج، سخن شناس اور محفل آرا انسان کی حیثیت سے وہ ہندوستان اور بعد میں پاکستان کے ہر بڑے شہر میں جان محفل رہ چکے تھے۔ ان کی یہی خوش نصیبی کچھ کم نہ تھی کہ وہ پطرس بخاری کے چھوٹے بھائی تھے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر ان کی خوش نصیبی یہ تھی کہ ان کی شہرت اور اہمیت میں ان کے اس رشتے کو کوئی دخل نہ تھا۔ دونوں بھائی اپنی انفرادی خوبیوں اور امتیازی صلاحیتوں کی بدولت نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی

شہرت اور مقبولیت کے مالک بنے۔ ایک ہی خاندان کے دو فرد یا دو بھائیوں کے اتنے ممتاز و مقتدر ہونے کی مثالیں دُنیا میں کم ملتی ہیں۔

غرض کہ جب بخاری صاحب کنٹرولر آف ریڈیو پاکستان کی حیثیت سے پہلے پہل ڈھاکے آئے تو اس سے برسوں پہلے وہ معروف، ممتاز اور مقتدر شخصیت بن چکے تھے۔ پھر بھی میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسے آپ میری بے خبری، لاعلمی، جہالت جو چاہیں کہہ لیں۔

بخاری صاحب ہر سال اپنے دفتری دورے پر ڈھاکے آتے رہتے۔ بسا اوقات شادانی صاحب کے ہاں ان سے ملاقات ہو جاتی اور اگر نہ ہوتی تو شادانی صاحب اتنا ضرور بتا دیتے کہ کل یا پرسوں بخاری صاحب آئے تھے۔ تمہیں پوچھ رہے تھے۔ چونکہ میں شادانی صاحب اور بخاری صاحب کی صحبت میں سراپا عقیدت اور احترام بن کر بیٹھتا تھا اس لیے بخاری صاحب کو میری خاموشی اور سنجیدگی پسند نہ آئی۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے ازراہ مذاق شادانی صاحب سے کہا کہ اگر میرا بس چلتا تو میں اس لڑکے کو کسی مقبرے کا مجاور بنا دیتا۔ ایک دن شادانی صاحب کی موجودگی میں کہنے لگے۔ میاں میرا جی چاہتا ہے کہ ایک دن آپ کے والد صاحب کی موجودگی میں آپ کو اتنا گدگداؤں کہ آپ کی تمام عمر کی سنجیدگی کی تلافی ہو جائے۔ بخاری صاحب اپنی ذات سے سنجیدگی اور بے تکلفی، شائستگی اور شگفتگی، زندہ دلی اور خوش طبعی، انکسار اور انانیت، اداکاری اور بے ساختگی کا ایک دل آویز اور کم یاب امتزاج تھے۔

جن دنوں میں ڈھاکا یونیورسٹی میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کا طالب علم تھا ڈھاکے میں دائرۂ ادب نام کی ایک ادبی انجمن تھی جس کے زیر اہتمام شعر و سخن کی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ مجھے اس انجمن کا جوائنٹ سیکرٹری، سیکرٹری، نائب صدر اور صدر سبھی کچھ ہونے کا شرف حاصل رہا۔ اس انجمن کی اکثر نشستوں میں وحشت کلکتوی عندلیب شادانی، فضل احمد کریم فضلی، اقبال عظیم، سرور بارہ بنکوی اور اقسر ماہ پوری وغیرہ

شریک ہوتے تھے۔ ڈھاکے میں جب کوئی ممتاز ادیب یا شاعر مغربی پاکستان یا ہندوستان سے آتا تو اس کے اعزاز میں دائرۂ ادب کی طرف سے خصوصی جلسے کا اہتمام ضرور کیا جاتا۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالحق، جگر مرادآبادی اور بخاری صاحب وغیرہ کے اعزاز میں کئی جلسے ہوئے۔ بخاری صاحب دائرۂ ادب کے جلسوں سے ہمیشہ محظوظ اور مسرور ہو کر واپس جاتے۔

جس زمانے میں میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا ریڈیو پاکستان کی طرف سے پروگرام اسسٹنٹ کی اسامیوں کا اشتہار نکلا۔ اگرچہ میرا نصب العین ایم۔ اے کر کے یونیورسٹی لکچرر بننا تھا لیکن گھریلو حالات کے زیرِ اثر میں بھی پروگرام اسسٹنٹ کے عہدے کا امیدوار بن گیا۔ اس زمانے میں امیدواروں کا انٹرویو لینے کے لیے خود بخاری صاحب ڈھاکے آتے تھے۔ بخاری صاحب سے متعدد ملاقاتوں کے باوجود میں ان کی شخصیت سے اس درجہ مرعوب تھا کہ انٹرویو میں ان کے سوالوں کا صحیح جواب نہ دے سکا۔ نتیجتاً میرا انتخاب نہ ہو سکا۔ وقتی طور پر دل کو ملال تو ضرور ہوا لیکن اس کے باوجود بخاری صاحب سے میری شیفتگی اور عقیدت برقرار رہی۔

بخاری صاحب شادانی صاحب کے ہاں آتے تو بیسیوں واقعات اور لطائف سناتے۔ اب وہ ساری باتیں تو یاد نہیں، البتہ ایک واقعہ ابھی تک یاد ہے۔ قیامِ پاکستان کے ابتدائی دور میں کسی موضوع پر حسن عسکری صاحب اور ڈاکٹر تاثیر کے درمیان چل گئی تھی۔ اس سلسلے میں عسکری صاحب نے ساقی کراچی میں تاثیر صاحب کے خلاف جو مضمون لکھا تھا وہ بخاری صاحب کو بے حد پسند آیا تھا۔ دیر تک مزے لے لے کر شادانی صاحب سے اس مضمون کا ذکر کرتے رہے۔ ان کے سنائے ہوئے لطیفوں میں سے دو تین لطیفے بھی سنتے چلیے۔

ایک دن بعض شعرا کی بے تکی شاعری موضوعِ گفتگو تھی۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے لاہور کے ایک ایڈیٹر کا جو تیس چالیس سال پہلے کچھ سیاسی اہمیت رکھتے

تھے ان کا ذکر کیا۔ نام غالباً محمد حبیب تھا۔ ایک مرتبہ کسی سیاسی معاملے میں گرفتار ہو گئے۔ جب رہا ہو کر آئے تو رہائی کی خوشی میں ان کے دوستوں نے جشن منایا۔ اس موقع پر ان کے کسی شاعر دوست نے ایک نظم پڑھی۔ حبیب صاحب نے اس فریم کی ہوئی نظم کو اپنے دفتر میں دیوار پر آویزاں کر دیا۔ ایک مدت تک ان کا وطیرہ یہ رہا کہ جو کوئی ان سے ملنے آتا اسے بڑے فخر کے ساتھ اپنی گرفتاری اور جشنِ رہائی کے واقعات سناتے اور اس سے وہ نظم پڑھواتے۔ نظم کا پہلا شعر یہ تھا ؎

رہا ہو کے آخر حبیب آگیا
یہ مردِ عجیب و غریب آگیا

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اربابِ ذوق پر اس شعر کا کیا اثر ہوتا ہوگا۔

ایک دن بخاری صاحب نے کہا کہ طالب علمی کے زمانے میں جب وہ کسی مولوی صاحب سے فارسی پڑھتے تھے تو ایک دن انھوں نے مولوی صاحب سے پوچھا۔ مولوی صاحب! پرسشِ گناہ کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ مولوی صاحب نے فرمایا۔ پرسشِ گناہ کے معنی یہ ہیں کہ تو نے گناہ کیوں کیا۔ اس پر بخاری صاحب نے کہا تو پھر حضرت سعدی کا جو یہ شعر ہے ؎

روزِ محشر کہ جاں گداز بود
اولیں پرسشِ نماز بود

تو کیا اس کے معنی یہ ہوئے کہ قیامت کے دن یہ پوچھا جائے گا کہ تو نے نماز کیوں پڑھی؟ مولوی صاحب بخاری صاحب کی اس شرارت آمیز تشریح پر بہت برہم ہوئے اور انھیں سخت ڈانٹ پلائی۔

بخاری صاحب جس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ریجنل ڈائرکٹر تھے اکثر شام کے وقت خواجہ حسن نظامی کے یہاں جانکلتے۔ ان کے یہاں ارباب علم اور ارباب عقیدت کا دربار لگا رہتا۔ بقول بخاری صاحب خواجہ صاحب کو آئے دن نئی سے نئی بات سوجھتی رہتی۔ ایک دن اُنھوں نے حاضرین محفل کے سامنے یہ خیال پیش کیا کہ یہ جو سال کے بارہ مہینے ہیں ان میں سے ہر ایک کے عربی نام کی جگہ کسی مشہور قومی لیڈر کا نام کیوں نہ رکھا جائے۔ خواجہ صاحب کی خاطر بہت سوں نے اس تجویز کی تائید کی۔ بخاری صاحب خاموشی سے تجویز اور تائید سُنتے رہے۔ آخر میں خواجہ صاحب نے بخاری صاحب سے کہا۔ حضرت آپ بھی تو کچھ کہیے۔ آخر آپ کی کیا رائے ہے؟ بخاری صاحب نے کہا۔ تجویز نہایت عمدہ ہے اور کیا عرض کروں۔ خواجہ صاحب بولے۔ اس میں آپ کو کون سی عمدگی نظر آتی ہے؟ بخاری صاحب نے جواب دیا۔ اُس تجویز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں رمضان کا مہینہ کہیں نہیں آنے پاتا۔ اس جواب سے محفل زعفران زار بن گئی۔

بخاری صاحب کی ذات میں ایک نہایت اعلیٰ درجے کا اداکار ہمیشہ کارفرما رہا۔ لیکن اُنھوں نے پیشہ ور اداکار بننے سے ہمیشہ گریز کیا۔ شادانی صاحب کے ہاں میں نے خود اپنی زبان سے یہ کہتے سنا کہ ہالی وڈ والوں نے انھیں چار پانچ سال کے لیے ایک غیر معمولی پیشکش کی۔ لیکن اُنھوں نے اسے قبول نہ کیا۔ ان کی روزمرہ گفتگو اور ان کے شعر پڑھنے تک کے انداز میں ان کی اداکارانہ صلاحیت جلوہ گر ہوئے بغیر نہ رہتی۔ اُنھیں ناپسند کرنے والے ان کی اس خصوصیت کی بنا پر اُنھیں بھانڈ بخاری کہنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ جہاں تک نام کا تعلق ہے بخاری صاحب اپنے ملک میں کئی ناموں سے جانے پہچانے جاتے رہے ہے۔ مثلاً بھانڈ بخاری، (اپنے ناؤ بھاؤ کی بنا پر) چھوٹے بخاری (چونکہ پطرس بخاری سے چھوٹے تھے) کسی نے از راہ ظرافت پطرس بخاری کو صحیح بخاری کہہ دیا تو اس رعایت سے زیڈ اے بخاری غلط بخاری بھی کہلائے۔

اپنی ایک کمزوری کے اعتبار سے بخاری صاحب فراقؔ گورکھپوری سے کچھ کم بدنام نہیں، لیکن دونوں کی خوبیوں کا پلہ اتنا بھاری ہے اور دونوں کی شخصیتوں میں دل آویزیاں اتنی ہیں کہ دونوں اپنے اپنے ملک کے لیے باعثِ فخر ہے اور رہیں گے۔ کسی مغربی ادیب نے گوئٹے کے کارنامے کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہا تھا کہ جس قوم نے گوئٹے جیسا شاعر پیدا کیا ہے۔ اس کا ہر گناہ معاف کیا جا سکتا ہے۔ اچھائی اور بُرائی کے بارے میں صدیوں پہلے عمر خیام نے جو ایک رباعی کہی تھی وہ آج بھی انسان سے غور و فکر کا مطالبہ کر رہی ہے ؎

گر مے نخوری طعنہ مزن مستاں را　　بنیاد مکن تو حیلہ و دستاں را
تو غرہ بداں مشو کہ مے می نخوری　　صد کار کنی کہ مے غلام است آں را

یہ بات عجیب ہی نہیں افسوس ناک بھی ہے کہ پاکستان کے باکمالوں کی جتنی اور جیسی قدر پاکستان سے باہر ہوتی ہے اتنی اور ویسی پاکستان میں کبھی نہ ہوئی۔ ایک مرتبہ شادانی صاحب ہی کے یہاں اپنے امریکہ کے دورے کا ذکر کرتے ہوئے بخاری صاحب نے بتایا کہ جب کبھی امریکہ جانا ہوتا ہے۔ براڈ کاسٹنگ اسٹیشنز اور گراموفون کمپنیاں ان کی آواز کو ریکارڈ کرنے کے لیے اس قدر ان کے درپے ہو جایا کرتی ہیں کہ بس۔

بخاری صاحب اپنی آواز کے اعتبار سے ایک عظیم براڈ کاسٹر ہی نہیں اپنی خوش بیانی کے اعتبار سے ایک عظیم کمنٹیٹر بھی تھے۔ مجھے کبھی ان کی کمنٹری سننے کا اتفاق نہ ہو سکا۔ لیکن سنا ہے کہ لیاقت علی خاں کے جنازے کے اُٹھنے سے لے کر ان کی تجہیز و تکفین تک بخاری صاحب نے جو کمنٹری دی وہ سُننے والوں کی کا ایک عظیم تجربہ تھی۔ اس کمنٹری سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی ذات میں کتنا بڑا مقرر پوشیدہ تھا۔

۱۹۶۰ء، ۱۹۷۰ء کے درمیان مجھے کراچی میں ریڈیو کے ذریعہ ان کی دو تقریریں سننے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے ایک تقریر علامہ اقبال کالج کراچی کی ایک ادبی تقریب سے متعلق تھی جس میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن میں کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکا۔ بخاری صاحب کی دوسری تقریر خود ریڈیو پاکستان کے ایک جشن موسیقی سے متعلق تھی۔ دونوں تقریروں کا ہر جملہ اور ہر جملے کا طرزِ ادا اتنا دلکش تھا کہ جی چاہتا تھا ان کی یہ تقریریں مختصر ہونے کی بجائے طویل اور بہت طویل ہوتیں۔

۱۹۴۹ء سے جب ڈھاکے میں بخاری صاحب کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے شروع ہی میں دائرۂ ادب ڈھاکا کے زیرِ اہتمام بخاری صاحب کے اعزاز میں شعر و سخن کی محفلیں منعقد کر کے بخاری صاحب کی کچھ غزلیں جمع کر لیں۔ اس زمانے میں پشاور سے فارغ بخاری کے رسالہ "سنگ میل" کا ایک ضخیم سرحد نمبر شائع ہوا تھا جب میں نے دیکھا کہ اس نمبر میں بخاری صاحب کی شاعری پر کوئی مضمون تو در کنار سرحد کے اردو شاعروں میں بخاری صاحب کا نام تک نہیں لیا گیا تو میں نے نیاز فتح پوری کو لکھنؤ خط لکھا کہ بخاری صاحب اردو کے اتنے اچھے شاعر ہیں لیکن چونکہ اب تک ان کا کلام اور مجموعۂ کلام منظرِ عام پر نہیں آیا اس لیے اردو شعر و ادب کے قارئین ان سے ناواقف ہیں۔ میرے پاس بخاری صاحب کی چند غزلیں ہیں اگر آپ فرمائیں تو ان غزلوں کی بنیاد پر ایک مضمون لکھ کر بھیجوں۔ نیاز صاحب نے میرے خط کے جواب میں لکھا کہ چند غزلوں کی بنیاد پر مضمون لکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

قیامِ پاکستان کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا کبھی کبھار پاکستان کے بعض رسالوں میں بخاری صاحب کی غزلیں چھپتی رہیں لیکن قیامِ پاکستان کو ربع صدی گزرنے کے باوجود میں نے اردو شاعری کے کسی جائزے میں پاکستان یا ہندوستان کے کسی اردو نقاد کو بخاری صاحب کی شاعری کا حوالہ دیتے یا اس سے بحث کرتے نہیں دیکھا۔

غالباً میں پاک و ہند کا واحد اردو نقاد ہوں جس نے "فنون" کے غزل نمبر (مطبوعہ ۱۹۶۹ء) میں بخاری صاحب کی شاعری پر اظہار خیال کیا۔

گزشتہ چھبیس ستائیس سال کے دوران میں میں اس بات پر ہمیشہ حیران رہا کہ اردو کے دو نہایت عمدہ غزل گو حفیظ ہوشیار پوری اور بخاری صاحب طباعتی دشواریوں سے دوچار نہ ہونے کے باوجود اپنا مجموعۂ کلام کیوں نہیں چھپواتے۔ بخاری صاحب کے معاملے میں مجھے اپنے اس سوال کا جواب دو تین دن پہلے ملا جب ان کی وفات سے متعلق پاکستان ٹیلی وژن کے ایک پروگرام میں بخاری صاحب کو یہ کہتے دکھایا گیا کہ میں اپنا مجموعۂ کلام کیا چھپواؤں، میر، غالب اور اقبال وغیرہ کی کتابوں کے مقابلے میں میری کتاب کی کیا حیثیت ہوگی۔

بخاری صاحب کے اس عذر میں ان کی جو شاعرانہ بلند حوصلگی کارفرما تھی وہ آج کی طباعت پسند اور شہرت پسند دُنیا میں نہایت حیرت انگیز بھی ہے اور حد درجہ قابلِ تعریف بھی، تاہم میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا کہ جب تک کوئی شاعر میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، سعدیؔ، حافظؔ شیرازی بیدلؔ اور نظیریؔ جیسے شاعروں کا ہم ردیف نہ ہو اسے اپنا مجموعۂ کلام چھپوانا ہی نہیں چاہیے۔ مہذب انسان کے حق میں چھوٹے سے چھوٹے شاعر کا ایک اچھا شعر بلکہ ایک اچھا مصرع بھی بڑی نعمت ہے۔ اس لیے بالعموم کسی شاعر کو اور بالخصوص بخاری صاحب جیسے خوش فکر شاعر کو زیب نہیں دیتا کہ مہذب دُنیا کو اپنے اشعار کی نعمت سے محروم کر جائیں۔ رہا مقام و مرتبے کا سوال سو اس معاملے میں حوصلے کی حد سے بڑھی ہوئی بلندی شعر و ادب کے حق میں مفید سے زیادہ مضر ثابت ہوگی۔ اردو شاعری میں بخاری صاحب کا مرتبہ کیا ہوگا؟ اس فیصلے تک پہنچنا آسان نہیں، لیکن اس بات پر اتفاق رائے آسان بھی ہے اور یقینی بھی کہ بخاری صاحب کے یہ اشعار یا اس قبیل کے اشعار اردو شاعری کے سرمائے میں خوب صورت، قابل قدر اور غالباً ناقابلِ فراموش اضافہ ہیں ؂

وہی گناہ جسے دل گناہ کہہ نہ سکے — ہم اس محاسبۂ خیر و شر سے درگزرے
تری نظر کا وہ معیار ہے کہ اہلِ ہنر — ترے حضور خرد و ہنر سے درگزرے

مہر و ماہ و انجم کی بے نیازیاں توبہ — دوست ہو کہ دشمن ہو آدمی غنیمت ہے

شبِ فرقت کی تیرگی اے دل — منحصر رات پر نہیں ہوتی
فرق ہے رات رات میں پیارے — رات کس کی بسر نہیں ہوتی

خوابِ اُمید کی تعبیر نظر آتی ہے — یہ بھی ثابت ہو اگر خواب تو پھر کیا ہوگا

برہم ہونے والی محفل یوں بھی برہم ہو جاتی
ہم کہہ کے ہوئے بدنام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

بیشتر خدا پایا اور برملا پایا — ہم نے تیرے بندوں کو تجھ سے بھی سوا پایا

بزم میں تو ہم دونوں اجنبی سے رہتے ہیں
کوئی تم کو کیا سمجھے، کوئی ہم کو کیا جانے

میکدے کو کیوں بُرا کہتے ہیں لوگ — ہم ہوئے جو کچھ یہیں رہ کے ہوئے

ہم نے فرہاد کو موضوعِ سخن ٹھہرایا — ذکر اپنا بہ حدیثِ دگراں لازم ہے

آبادیِ دل کی ہے فقط ایک ہی صورت — بربادیِ دل کے لیے سامان ہزاروں

بخاری صاحب کو شاعری میں، صرف غزل گوئی سے دلچسپی تھی اور غزل گوئی میں ان کا رنگ کلاسیکی تھا لیکن کلاسیکی رنگ کے معنی یہ نہیں کہ ان کی شاعری صرف زبان و بیان یا رسمی موضوعات و مضامین کی شاعری تھی۔ اگرچہ ان عناصر سے ان کی شاعری خالی نہیں ہے، لیکن ان کی شاعری میں وہ امتیازی اوصاف موجود ہیں جو انھیں اردو کے بے شمار غزل گویوں سے مختلف اور منفرد بناتے ہیں "بخاری مرحوم" کے عنوان سے پاکستان ٹیلی وژن کے پروگرام میں خود بخاری صاحب کی زبان سے یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ان کے اشعار کی بیاض احمد فراز اور نصیر ترابی ان سے چھین کر بلکہ ان کے یہاں سے چرا کر چھپوانے کی غرض سے لے گئے ہیں خدا کرے بخاری صاحب کے یہ دونوں پرستار ان کی غزلوں کا مجموعہ جلد سے جلد منظر عام پر لا سکیں۔ اگر زندگی نے مہلت دی تو ان کے مجموعۂ کلام پر کبھی تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کروں گا۔

۱۹۶۱ء میں ڈھاکے سے میری پہلی کتاب میرے انشائیوں کا مجموعہ "شہرت کی خاطر" شائع ہوئی۔ غالباً اس وقت تک بخاری صاحب ریڈیو پاکستان سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ یوں بھی میری ان کی ملاقات کے درمیان طویل وقفہ گزر چکا تھا۔ میں نے "شہرت کی خاطر" کی ایک جلد ان کی خدمت میں کراچی بھیج دی۔ اگرچہ ان کی طرف سے کتاب کی رسید تک ملنے کی توقع نہ تھی لیکن ایک دن خلاف توقع ان کا خط آگیا۔ میرے پاس لے دے کر ان کی یہی ایک یادگار ہے۔ پھر چونکہ ان کا یہ خط عام دلچسپی سے خالی نہیں، اس لیے بیجا نہ ہوگا اگر یہ خط جوں کا توں یہاں نقل کر دیا جائے۔ یہاں ضمناً یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ان کے خط کا زیادہ تر حصہ میرے بمبئی کے اس سفرنامے سے متعلق ہے جو "غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد" کے عنوان سے میرے انشائیوں کے مجموعے "شہرت کی خاطر" میں شامل ہے۔ بمبئی کا یہ سفر ۱۹۵۰ء میں کیا گیا تھا۔ بمبئی کے اس سفرنامے میں اردو کے متعدد ممتاز اہل قلم مثلاً کرشن چندر، مہندر ناتھ، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، ظ انصاری، کیفی اعظمی، آرزو لکھنوی وغیرہ سے طالب علمانہ اور نیازمندانہ ملاقاتوں کا ذکر ہے۔ اب بخاری صاحب کا خط

ملاحظہ ہو۔

عزیز من ۔ دُعا

میں شکریے اور مسرت کا خط لکھنے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ تمھارا خط ملا۔ "شہرت کی خاطر" میں بہت کچھ ہے۔ مگر سب سے زیادہ تمھاری سادگی اور تمھارا خلوص ہے۔ بات چاہے کچھ بھی نہ ہو مگر کتاب کھولو تو بند کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک پُر خلوص اور فقیر منش سے کوئی مصروف گفتگو ہے۔ تمھاری فقیر منشی کی انتہا بمبئی کے احوال میں پائی جاتی ہے۔ علم کی تشنگی تم کو کن پھسڈی مگر جغادری قسم کے لوگوں میں لے گئی۔ ان کے کیسے کیسے اسٹیجی (نہ کہ ڈرامائی) فقروں میں تم نے معنی ڈالنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ڈبلو بی ییٹس (W.B.YEATS) کو ایک مرتبہ کینیڈا جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں خدائی قسم کے سرپھروں نے اسے گھیر لیا۔ ییٹس ایسے جھمیلوں سے بہت گھبراتا تھا۔ مگر غریب پھنس گیا۔ فقیر منش آدمی کرتا تو کیا کرتا۔ چپ سادھ لی۔ کھانے کی لمبی میز پر اس کے فدائی بیٹھے اس کے ہونٹوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ کچھ گوہر افشانی کرے اور ہم اپنی نوٹ بک میں لکھ لیں۔ ییٹس ان کی گرم نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ مجذوبانہ انداز میں پکار اُٹھا۔ "کل۔" اور اس کے بعد چپ، کھانے کے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ چھری کانٹوں کی کھٹ کھٹ یک لخت بند ہو گئی۔ سب کی گردنیں ربڑ کی گردنوں کی طرح ییٹس کی طرف کھنچ گئیں۔ سب منتظر۔ اس ارمان انگیز لفظ "کل" کے بعد ییٹس کیا کہنے والا ہے۔ مگر جب وہاں ایک خاموشی تری سب کے جواب میں، والا معاملہ دیکھا تو ایک نے جرأت کر کے درخواست کی کہ حضور 'کل' کے متعلق کچھ اور ارشاد فرمایئے۔ ییٹس بولا۔ کل کے متعلق کیا عرض کروں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کل کے سفر میں ریل گاڑی پر مجھے صبح کا ناشتہ ملے گا یا نہیں۔

خدا تم کو خوش رکھے اور "شہرت کی خاطر" کو شہرت دوام بخشے۔ یہ کتاب

ہے اس قابل ۔ ماشاراللہ ۔

دُعاگو

خاکسار

بخاری

(ذوالفقار علی بخاری)

۱۹۶۲ء کے آخر میں میرے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "تاثرات و تعصبات" چھپا۔ غالباً ۱۹۶۳ء میں بخاری صاحب کسی ذاتی کام سے آخری مرتبہ ڈھاکے آئے۔ خبر ملی کہ فلاں محلے میں اپنے داماد کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک دن شام کے وقت "تاثرات و تعصبات" کی ایک جلد لے کر بخاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو دیکھا کہ اس کمرے کی حد درجہ مصفا اور مجلا فضا میں بخاری صاحب اپنی دو ڈھائی سالہ نواسی سے کھیل رہے ہیں۔ اس وقت ڈرائنگ روم میں ہم تین کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ میں نے اپنی کتاب ان کی نذر کی۔ اُنھوں نے اسے یہاں وہاں سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ جگر مراد آبادی سے متعلق مضمون کے بعض صفحات پر نظر ٹھہر گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جس قدر حسرت کے پرستار ہیں اتنے ہی جگر کے منکر ہیں۔ جگر کے بعض شعروں پر اس وقت بھی اعتراض کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اب یاد نہیں وہ اعتراض کیا تھے۔ وہ جگر کی صرف ایک غزل کے قائل تھے جس کا مطلع یہ ہے ؎

کبھی شاخ و سبزۂ برگ پر کبھی غنچۂ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصلِ بہار پر

میں نے کہا اس کتاب کے متعلق مجھے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ کہنے لگے رائے تو نقادوں سے لکھوانی چاہیے۔ میں کوئی نقاد نہیں۔ میں نے کہا میں نقادوں

سے زیادہ آپ جیسے اہلِ نظر اور سخن شناس کا قائل ہوں۔ اس گفتگو کے کچھ دیر بعد میں اُن سے اجازت لے کر واپس چلا آیا۔ بخاری صاحب نے اس کتاب کے بارے میں رائے نہیں بھیجی۔ میں نے تقاضا بھی نہیں کیا۔

بخاری صاحب کی زندگی کا خاصا حصہ مغربی ممالک میں گزرا تھا۔ لیکن ان کی تعلیم و تربیت اور ان کے شعری و ادبی ذوق کی تشکیل اس حد تک مشرقی روایات میں ہوئی تھی کہ مغربیت ان کی مشرقیت پر غالب نہ آ سکی۔ شعر و ادب کے معاملے میں اُنھیں جدید نظریات و خیالات سے زیادہ اردو اور فارسی کے کلاسیکی شعر و ادب سے دلچسپی تھی۔ اگرچہ اردو کے معاملے میں وہ اہلِ زبان میں سے نہ تھے لیکن اردو و لغات و محاورات پر ان کی نظر اتنی وسیع تھی کہ خود اہل زبان حضرات لفظوں کے صحیح تلفظ اور نامانوس یا متروک الاستعمال محاورات کے معنی اور محلِ استعمال کے بارے میں ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں مجھے ایک صاحب نے بتایا تھا کہ بخاری صاحب کلام انیس کے محاورات کا لغت مرتب کر رہے تھے۔ نہ جانے یہ کام مکمل ہو سکا یا نہیں۔ علم عروض سے بھی ان کی واقفیت لائق استفادہ تھی۔ موسیقی کے فن میں انھیں اتنا درک تھا کہ اُنھوں نے موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی جو شائع ہو چکی ہے۔ اگرچہ شاہد احمد دہلوی جیسے موسیقی کے امامِ فن نے میرے استفسار پر بخاری صاحب کی اس کتاب کے بارے میں کوئی بلند رائے ظاہر نہیں کی، لیکن مجھے یقین ہے کہ بخاری صاحب کی یہ کتاب فن موسیقی کے عام طالب علموں کے لیے ضرور مفید اور کارآمد ہوگی۔

جون ۱۹۴۸ء سے دسمبر ۱۹۶۹ء تک میری زندگی ڈھاکے میں گزری اور ڈھاکے کے قیام کا یہ طویل حصہ اس تمنا میں گزرا کہ کراچی میں رہنے کی صورت نکل آئے تو وہاں کی کتنی ہی دلکش، اہم اور عظیم شخصیتوں سے محظوظ و مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے۔ دسمبر ۱۹۶۹ء میں سیاسی حالات کی بدولت ڈھاکے کو خیرآباد کہہ کر کراچی آ رہنے کا موقع تو ضرور ملا۔ لیکن یہاں کی محبوب و محترم شخصیتوں کی صحبتوں سے محظوظ و مستفید ہونے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اول تو اس معاملے میں کراچی کے فاصلے سدِ راہ بنے اور اس سے بھی زیادہ وہاں کے رہنے والوں کے دلوں کے فاصلے مانع آ گئے۔

کراچی میں بخاری صاحب سے میری پہلی ملاقات جشن جوش کی تقریب میں ہوئی جو ہوٹل انٹرکونٹی نینٹل میں منعقد ہوئی تھی۔ جب بخاری صاحب میرے قریب سے گزرے تو میں نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب ضرور دیا لیکن جواب دے کر اس طرح گزر گئے جیسے مجھے سرے سے پہچانتے ہی نہیں ان سے اسی طرح کی دوسری ملاقات اس شاندار تقریب میں ہوئی جو فیض صاحب کے اعزاز میں پی ای سی ایچ سوسائٹی کے گرلز کالج میں ہوئی تھی۔ وہاں بھی جب بخاری صاحب میرے قریب سے گزرے تو معاملہ علیک سلیک سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ان دو ملاقاتوں کے بعد ان سے ملنے کی کوئی خواہش میرے اندر باقی نہ رہی۔ لیکن ان سے ایک تیسری اور آخری ملاقات ہوئی تھی سو یوں ہوئی کہ غالباً ۱۹۷۱ء میں ایک دن ہمارے اردو کالج کے رفیقِ کار اور میرے نہایت عزیز دوست محمد فائق (پروفیسر شعبۂ نفسیات) جو کراچی میں ایک نہایت دلچسپ براڈکاسٹر اور اردو کے نہایت عمدہ مقرر کی حیثیت سے مشہور و مقبول ہیں مجھے علامہ اقبال کالج کراچی کی ایک تقریب میں پکڑ لے گئے اور تقریب کے ختم ہونے سے پہلے خود کچھ اور لوگوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر اور اپنی گرفتاری میں مجھے بھی شامل کر کے گرومندر کے پاس غالباً اسلامیہ گرلز کالج پہنچا دیئے گئے۔ راستے میں گرفتاری کا مقصد یہ بتایا گیا کہ اس کالج میں ادبی عدالت کی تقریب منعقد ہو رہی ہے جس میں ایک فریق کی قیادت اور وکالت فائق کو کرنی ہے۔ کراچی میں ادبی عدالت ایک نہایت عمدہ روایت ہے جو کالجوں کے علاوہ سال میں ایک مرتبہ ریڈیو اسٹیشن اور بعض اوقات کراچی یونیورسٹی میں بھی برتی جاتی ہے۔ اس میں قانونی عدالت کی طرح تین ججوں (جن میں سے ایک چیف جج ہوتا ہے) کے روبرو کسی ادبی یا ثقافتی مسئلے پر دو فریقین (مدعی اور مدعا علیہ) کے وکلا کے درمیان بحث ہوتی ہے اور بحث کے بعد منصفین اپنے متفقہ فیصلے کا اعلان کرتے ہیں۔ کراچی کی ادبی عدالتوں میں بسا اوقات فائق اور انجم اعظمی مخالف فریقین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ منصفین کے

فرائض کی انجام دہی کے لیے ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں سے کسی تین کو مدعو کرلیا جاتا ہے۔

اس دن فائق بہت تھکے ہوئے تھے اور اُنھیں جس موضوع کی وکالت کرنی تھی اس کے لیے ذہنی طور پر تیار بھی نہ تھے۔ جب ہم دونوں گرلز کالج پہنچے تو پتا چلا کہ چیف جج تو بخاری صاحب ہوں گے۔ باقی دو ججوں میں غالباً حیدرآباد کے کمشنر صاحب موجود تھے اور تیسرے جج صاحب (غالباً فیض صاحب) نے عین وقت پر معذرت کہلا بھیجی تھی یا ان کے آنے کا امکان نہیں رہ گیا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر فائق نے کالج یا ادبی عدالت کے منتظمین کو مشورہ دیا کہ تیسرا جج مجھے بنا دیا جائے اور مجھے ہدایت یہ دی کہ جب وہ دکیلانہ تقریر شروع کریں تو میں ان کی تقریر کے دوران جج کی حیثیت سے ایسے سوالات یا اعتراضات کرتا رہوں جن کی مدد سے بحث آگے بڑھتی رہے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ فائق کے مخالفین بھی ذہنی طور پر کوئی خاص تیاری کرکے نہیں آئے تھے بخاری صاحب اور کمشنر صاحب بھی وکلا کی بحثوں سے گہری دلچسپی نہیں لے رہے تھے بلکہ بخاری صاحب کے طرزِ عمل سے تو یہ ظاہر ہورہا تھا کہ یہ مباحثہ جس قدر جلد ختم ہوجائے بہتر۔ بہرحال میرے سوالات اور اعتراضات نے دونوں فریقین کی بحثوں کو دیر تک جاری رہنے میں مدد دی۔ ایک موقع پر بخاری صاحب کو شبہ ہوا کہ ایک وکیل نے جو شعر دلیل کے طور پر پیش کیا ہے وہ اس شاعر کا نہیں جس سے وہ منسوب کیا جارہا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے پوچھا۔ یہ شعر کس کا ہے؟ میں نے وثوق کے ساتھ بتایا کہ فلاں کا ہے۔

مباحثے کے خاتمے کے بعد جب ہم لوگ چائے پر جمع ہوئے تو بخاری صاحب میرے قریب آئے اور بولے میاں! آپ اس شہر میں رہتے ہیں تو مجھ سے ملتے کیوں نہیں؟ اس کیوں نہیں کے جواب میں

شکوے تھے اس قدر کہ شکایت نہ ہوسکی

ان کی بزرگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے صرف اتنا کہا کہ بخاری صاحب! آپ سے ملنے کو جی تو بہت چاہتا ہے لیکن اس بد نصیبی کا کیا علاج کہ آپ میرے ایسوں کی رسائی سے بالاتر ہیں۔ کہنے لگے۔ بالکل غلط، آپ مجھے کسی وقت کہیں سے فون کرکے شہر کے کسی حصے میں بلالیں میں اپنی گاڑی میں آکر آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔ ان کی اس غیر متوقع اور غیر معمولی پیشکش نے میرے دل سے تمام شکایتوں کو دھو دیا۔ میں نے ان کا فون نمبر نوٹ کرلیا۔ لیکن میرے ذاتی حالات نے مجھے انھیں کہیں بلانے یا مجھے ان کے یہاں جانے کا موقع نہ دیا۔ اس ملاقات کے کچھ عرصہ بعد میرا آب و دانہ مجھے اسلام آباد کھینچ لے آیا۔

یہ مضمون طویل تو ضرور ہوگیا۔ لیکن حق یہ ہے کہ بخاری صاحب کے بارے میں لکھنے کا حق ادا نہ ہوسکا۔ یہ حق تو ان کے خاص احباب اور پرانے رفقائے کار ہی ادا کرسکتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اپنے اس فرض کی ادائیگی میں کاہلی یا کوتاہی کو راہ نہ دیں۔ ہماری قوم میں بخاری صاحب سے بڑی شخصیت پھر کب پیدا ہو گی بھی یا نہیں، یہ کہنا مشکل ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ ان کے صاحب وسائل پرستار نہ صرف ان کے مجموعۂ کلام کو جلد سے جلد شائع کرنے کا انتظام کرتے بلکہ ان کی شخصیت سے متعلق ان کے قریبی جاننے والوں کے مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع کرڈالتے۔ ساتھ ہی ساتھ بخاری صاحب کے نجی خطوط کا بھی ایک مجموعہ منظر عام پر لے آتے۔ قیاس کہتا ہے کہ بخاری صاحب بہت اچھے مکتوب نگار بھی رہے ہوں گے۔ ایسے ہشت پہلو شخص کے اٹھ جانے کا ماتم کرنے سے زیادہ مناسب اور مفید کام یہ ہے کہ اس کی ہشت پہلو شخصیت کو لفظوں اور کتابوں میں محفوظ کرلینے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ کوئی شخص موت سے نہیں بچ سکتا، لیکن مرنے کے بعد بھی وہ زندہ رہ سکتا ہے اور رکھا جاسکتا ہے۔

۲۱ جولائی ۱۹۷۵ء

آغا محمد طاہر

طاہر صاحب سے میرے مراسم چند ملاقاتوں تک محدود تھے۔ پھر بھی جب ان کے انتقال کی خبر مجھ تک پہنچی تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی قریبی عزیز یا کوئی گہرا دوست داغِ مفارقت دے گیا۔ جس آدمی سے چند ملاقاتیں زندگی کے سرمایۂ نشاط میں اضافے کا باعث ہوسکتی تھیں اس کی دائمی جدائی شدید رنج و غم کا سبب کیونکر نہ ہوتی۔ طاہر صاحب بوڑھے ضرور ہو چکے تھے۔ لیکن بڑھاپے کی اس منزل تک ہرگز نہ پہنچے تھے جس کے ساتھ موت کا تصور وابستہ ہے۔ اسی لیے مجھے ان کی وفات قبل از وقت محسوس ہوتی رہی ہے۔ لیکن مشیت کے حساب کتاب کو کیا کہیئے اور کیا کیجیے۔

طاہر صاحب سے میری پہلی ملاقات آج سے پانچ چھ سال پہلے ڈھاکے میں ہوئی تھی بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ان سے میری ساری ملاقاتیں ڈھاکے میں ہوئیں اور شادانی صاحب کے یہاں ہوئیں۔ ان سے میرا تعارف شادانی صاحب ہی نے کرایا تھا۔ طاہر صاحب سے شادانی صاحب کے تعلقات ۱۹۲۴ء سے چلے آرہے تھے جب شادانی صاحب لاہور میں بی۔ اے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ طاہر صاحب شادانی صاحب کے چند مخصوص دوستوں میں سے تھے۔ شادانی صاحب بی۔ اے کی تعلیم کے لیے لاہور گئے تو انارکلی

سرائے میں قیام پذیر ہوئے۔ وہاں رہتے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ ایک روز مبارک علی اینڈ سنز کی دکان پر مبارک علی ہی کی بدولت طاہر صاحب سے ان کا تعارف ہو گیا۔ طاہر صاحب نے پوچھا آپ کا قیام کہاں ہے۔ شادانی صاحب نے جواب دیا۔ انار کلی سرائے میں۔ اس پر طاہر صاحب نے ان سے درخواست کی کہ میرے یہاں قیام فرمائیے۔ شادانی صاحب نے پہلے تو بہت انکار کیا۔ لیکن چونکہ سرائے کوئی معقول جائے قیام نہ تھی اس لیے طاہر صاحب کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو گئے اور ان کے ساتھ رہنے لگے۔

شادانی صاحب نے بی۔ اے کی تعلیم کے دوران میں بابا طاہر ہمدانی کی رباعیات کا مجموعہ اپنے نسخے کے ساتھ شائع کیا تو اس کو طاہر صاحب ہی کے نام سے معنون کیا اور اس میں ان کی تصویر بھی شائع کی۔ تصویر پر یہ شعر درج تھا ؎

گرچہ خوردیم نسبتی است بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم

اس شعر کے نیچے "طاہر نبیرۂ آزاد" لکھا ہوا ہے۔ انتساب کی عبارت حسبِ ذیل ہے۔

ڈیڈیکیشن

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگِ قبول
پھول کچھ میں نے چنے ہیں ان کے دامن کے لیے

پھولوں کا وہ ناچیز ہار جو مخلصانہ ارادت مندی کے ساتھ نذر کیا جائے

اہل بینش کی نظر میں اُس گراں بہا سلکِ مرواریدسے کہیں بہتر ہے جو محض نمود ظاہری کی خاطر پیش کی جاتی ہے۔ لہٰذا میں اپنی اس بے مایہ تصنیف کو ایک مخلص نیاز آگیں کی حیثیت سے محب گرامی قدر، فخرالاماثل جناب آغا محمد طاہر صاحب نبیرۂ آزاد مرحوم کے نام پر ڈیڈیکیٹ کرتا ہوں۔

خاک نشین عندلیب شادانی

طاہر صاحب جب کبھی ڈھاکے آتے تو شادانی صاحب ہی کے یہاں ٹھیرتے۔ اگر آپ طاہر صاحب کے دورانِ قیام میں شادانی صاحب کے یہاں گئے ہوتے تو آپ کو ہرگز یہ محسوس نہ ہوتا کہ ان کے یہاں کوئی صاحب مہمان آئے ہوئے ہیں اور اگر آپ نے طاہر صاحب کو شادانی صاحب کے والد مرحوم کی موجودگی میں شادانی صاحب کے یہاں دیکھا ہوتا تو کچھ عجب نہیں کہ ظاہری وضع قطع کی بنا پر آپ شادانی صاحب کے والد مرحوم کو مہمان اور طاہر صاحب کو میزبان سمجھ بیٹھتے کیونکہ شادانی صاحب کے والد صاحب ہمیشہ کُرتا پاجامہ پہنے اور دو پلّی ٹوپی اوڑھے برآمدے میں تخت پر بیٹھے رہتے۔ ان کے برعکس طاہر صاحب صرف بنیان اور لنگی پہنے کھری چارپائی یا آرام کرسی پر دراز رہتے۔ وہ اگر کسی سے بات نہیں کر رہے ہوتے تو چھت کی طرف نظریں کر کے اُردو یا فارسی کا کوئی شعر گنگنا رہے ہوتے۔ طاہر صاحب نچلے بیٹھنے کے قائل نہ تھے۔ وہ یا تو کچھ نہ کچھ بولتے رہتے یا کچھ نہ کچھ کرتے رہتے۔ اگر گنگناتے نہیں تو لطیفے کہتے۔ اگر لطیفے نہ کہہ رہے ہوتے تو کسی ضرورت سے جس کا علم ان کے سوا کسی اور کو نہ ہوتا کمرے میں چلے جاتے۔ پھر باہر آتے۔ اگر کوئی پھل بیچنے والا دروازے سے گزر رہا ہوتا تو اسے آواز دے کر بلا لیتے۔ مول تول کرتے۔ دام چک جاتے تو تھوڑے سے پھل خرید لیتے۔ کچھ خود کھاتے کچھ حاضرین کو کھلا دیتے۔ پھر اُنھیں خیال آتا کہ فلاں کام سے فلاں جگہ جانا ہے یا فلاں صاحب سے ملنا ہے تو اندر جا کر لباس تبدیل کرتے۔ یعنی کُرتا پاجامہ پہن لیتے اور ٹوپی اوڑھ لیتے اور ہاتھ میں چھڑی لیے خراماں

خراماں منزلِ مقصود کی طرف چل پڑتے۔ نہ ان کے لیے یہ ضروری کہ کھانے کے وقت تک ضرور واپس آئیں نہ شادانی صاحب اور ان کے گھر والوں پر یہ فرض کہ جب تک طاہر صاحب واپس نہ آئیں یہ لوگ کھانا نہ کھائیں۔ غرض کہ طاہر صاحب کا اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، چلنا پھرنا، آنا جانا، ملنا جلنا، بڑوں سے بات چیت، چھوٹوں سے چھیڑ چھاڑ، نوکروں سے لین دین، سب کچھ ٹھیک اسی طرح ہوتا تھا جس طرح گھر کے کسی فرد کا ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ لیکن دیرینہ دوستی اور بے تکلفی کے باوجود شادانی صاحب اور طاہر صاحب ایک دوسرے کو لفظ "تم" سے خطاب نہ کرتے۔

طاہر صاحب میں تکلف اور تصنع ذرا بھی نہ تھا۔ ان کی شخصیت سادگی بے تکلفی اور معصومیت سے عبارت تھی۔ ان کے چہرے پر ہر وقت ایک ایسی مسکراہٹ کی کیفیت رہا کرتی تھی جس میں ان کی خواہش اور کوشش کو کوئی دخل نہ تھا۔ ان کی آواز اور ان کے لب و لہجے میں ایک عجیب حلاوت تھی۔ وہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ لیکن ان کی خود اعتمادی میں عالمانہ وقار و پندار کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ البتہ ان کی ہر بات میں یا بہت سی باتوں میں "قلندرانہ شان ضرور پائی جاتی تھی۔

طاہر صاحب پہلی مرتبہ ڈھاکے آئے تو یہ کام میرے سپرد کیا گیا کہ اُنھیں ڈھاکا دکھلاؤں۔ ڈھاکا کوئی اتنا بڑا اور پیچیدہ شہر نہیں ہے کہ اسے دیکھنے کے لیے کسی رہنما کی مدد ضروری ہو۔ بہرحال میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ وہ جس بازار سے گزرتے بعض چیزوں کی قیمت پوچھ لیتے۔ سر راہے کھانے کی کوئی ایسی چیز بک رہی ہوتی جو ان کے لیے نئی ہوتی یا جسے کھانے کو ان کا دل چاہتا تو وہ اسے تھوڑی مقدار میں خرید لیتے اور وہیں کھڑے کھڑے کچھ خود کھا لیتے کچھ مجھے کھلا دیتے۔ پھر اس کے مزے پر تبصرہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ ایک مرتبہ ہم دونوں مٹھائی کی ایک معمولی دکان کے سامنے سے گزر رہے تھے جو اس زمانے میں ڈھاکا میڈیکل

کالج کے قریب تھی۔ طاہر صاحب نے دکان دیکھی تو اس میں داخل ہو گئے اور مٹھائیوں کا جائزہ لینے کے بعد اُنھوں نے اپنے اور میرے لیے دو ایک چیزوں کا آرڈر بھی دے دیا۔ اس قسم کی دکانوں میں بیٹھ کر کچھ کھانا سرِ رہگذر کھانے سے کم نہیں اور میں ان میں سے کسی کا عادی نہیں۔ لیکن جب میں نے طاہر صاحب کو سرِ رہگذر اور اس قسم کی دکان میں بے جھجک کھاتے دیکھا تو مجھے ان کی سادگی پر حیرت ضرور ہوئی۔

طاہر صاحب نہ ادیب تھے نہ شاعر۔ لیکن شعر و ادب سے دلچسپی انھیں وراثت میں ملی تھی۔ شعر و ادب سے محظوظ ہونے کے علاوہ اُنھیں اردو کے علمی و ادبی سرمایے کو محفوظ کرنے کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے جو کتابیں شائع کی ہیں ان کی اشاعت ان کے اسی شوق کی رہین منت ہے۔ طاہر صاحب قدیم رنگ سخن کے دلدادہ ہونے کے باوجود نئی شاعری اور نئے شعرا سے ناواقف نہ تھے بلکہ متعدد نئے شعرا سے ان کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔

نبیرۂ آزاد کے الفاظ طاہر صاحب کے نام کا جزو بن چکے ہیں۔ جب ان سے میرا تعارف نہ تھا تو ان کے نام کے ساتھ اس ٹکڑے کو دیکھ کر مجھے کوفت ہوتی تھی۔ مجھے اس ٹکڑے میں بزرگوں کے نام سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا جذبہ کارفرما نظر آتا تھا۔ لیکن جب ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے دیکھا کہ وہ کتنے بڑے اسلاف پرست ہیں تو میں ان کے نام کے ضمیمے کو ان کی اسلاف پرستی کا نتیجہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔

طاہر صاحب کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ تھی کہ وہ عموماً اپنے مخاطب کو "آغا جان" کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ میں نے ان سے اس اندازِ تخاطب کی وجہ کبھی نہیں پوچھی۔ البتہ دل میں یہ فرض کر لیا کہ یہ اندازِ تخاطب ایرانی ہے اور چونکہ طاہر صاحب ایران سے ہو آتے ہیں اس لیے ان کی یہ خصوصیت وہیں کا تحفہ ہے۔

طاہر صاحب کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ دورانِ گفتگو میں ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ تقسیم ہند سے پہلے مجھے دس بارہ ہزار اشعار یاد تھے لیکن تقسیم ہند کے سلسلے میں کشت و خون کے جو ہنگامے ہندوستان و پاکستان میں رونما ہوئے اُنھوں نے میرے حافظے کو اتنا کمزور کر دیا کہ اب بمشکل دس بارہ سو اشعار یاد ہوں گے۔ ان خونیں اور آتشیں ہنگاموں میں طاہر صاحب کو بڑے بڑے صدموں سے دو چار ہونا پڑا۔ وہ نہ لیڈر تھے نہ منسٹر۔ لیکن میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ کیا کہ اُن کی ذات بہت سوں کے لیے آسرا بھی تھی اور آلۂ کار بھی۔

طاہر صاحب پُرانی تعلیم و تہذیب کے ساختہ پرداختہ اور پُرانے نظامِ زندگی کے آوردہ تھے۔ میں نے اُنھیں پُرانی تعلیم، پُرانی تہذیب اور پُرانے نظامِ حیات کا بڑا مداح پایا۔ شعر و ادب کے باب میں بھی ان کا نقطۂ نظر قدیم ہی تھا۔

طاہر صاحب کسی غیر معمولی شخصیت کے مالک نہ تھے۔ لیکن ان کی شخصیت میں جاذبیت ضرور تھی۔ انھیں ہر عمر کے لوگوں سے مانوس ہو جانا اور اُنھیں اپنے آپ سے مانوس کر لینا آتا تھا۔ وہ بوڑھوں میں بوڑھے تھے، جوانوں میں جوان اور بچوں میں بچے۔ یہ بات بظاہر جس قدر آسان نظر آتی ہے اتنی آسان نہیں۔

اردو اور فارسی تو خیر ان کی خانہ زاد زبانیں تھیں لاہور میں ایک مدت تک رہنے کی وجہ سے پنجابی پر بھی اُنھیں خاصا عبور تھا۔ بعض اوقات پنجابی لطیفے پنجابی زبان میں سناتے اور اردو میں اُن کا ترجمہ کرتے جاتے۔ اُنھیں پنجابی زبان کے اشعار بھی یاد تھے۔ میں نے اُنھیں بارہا پنجابی شعر گنگناتے دیکھا۔ مجھے ان کی زبان سے پنجابی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔

طاہر صاحب نہ ادیب تھے نہ شاعر لیکن ایک شخصیت ضرور تھے۔ ایک ایسی شخصیت جو ہندوستانی مسلمانوں کے قدیم تہذیب و تمدن

کی نمائندہ بھی تھی اور یادگار بھی۔ افسوس کہ اب وہ یادگار بھی باقی نہیں
رہی لیکن جن لوگوں نے اس یادگار کو دیکھا ہے ان کے دلوں میں اس کی یاد
زندگی بھر باقی رہے گی۔

(۱۹۵۷ء)

ارشد کاکوی

سنہ ۱۹۵۰ء میں جب ارشد کاکوی ڈھاکے آئے تو وہ میرے لیے اجنبی تھے اور میں اُن کے لیے۔ لیکن اب ہم دونوں ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں اردو کے لکچرر وہ بھی ہیں اور میں بھی۔ تنقید نگاری اور شاعری سے دل چسپی انھیں بھی ہے اور مجھے بھی۔ زندگی کے بہت سے معاملات میں ان کا مذاق و میلان وہی ہے جو میرا ہے اور جہاں تک ہمراز ہونے کا تعلق ہے ارشد میرے راز دار ہوں یا نہیں میں اُن کا راز دار ضرور ہوں۔ لیکن اس میں میری کسی سازش یا سیاست کو دخل نہیں بلکہ اُن کے اُس اعتماد کو دخل ہے جس کی بنا پر وہ اپنی زندگی کے اہم ترین مسائل میں صلاح و مشورے کے لیے سب سے پہلے میرے پاس آتے ہیں اور میری صلاح لینے کے بعد تائید و تقویت کے لیے پھر کسی کے پاس نہیں جاتے۔

ارشد کو جو چیز پاکستان کھینچ لائی وہ "نئے وطن" کے وہی "حسین سپنے" تھے جن کی کشش نے بہتوں کو اپنے آبا و اجداد کا وطن چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ لیکن ارشد نے ان حسین سپنوں کی تعبیر کو کیسا پایا یہ اُن کے اِس شعر سے ظاہر ہے جو صرف اُنھیں کا نہیں بلکہ بے شمار لوگوں کا ترجمان ہے ؎

وطن میں دیکھا کیے ہمیشہ نئے وطن کے حسین سپنے
حسین سپنوں کی نیرہ بختی کہ آج تعبیر دیکھ لی ہے

ارشدؔ یہاں آنے سے پہلے پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔ اے (آنرز) کر چکے تھے۔ یہاں اُنھوں نے ایم۔ اے (اردو) میں داخلہ لے لیا۔ اُس وقت میں بی۔ اے فرسٹ ایر کا طالب علم تھا۔ پروفیسر عبدالقیوم حسرتؔ نعمانی مرحوم نے ارشدؔ سے میرا تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ وہ طالب علم ہی نہیں ادب دوست بھی ہیں اور ایک ادب دوست گھرانے کے چشم و چراغ بھی۔ ان کے والد پروفیسر شاہ عطاالرحمٰن کا نام برسوں پہلے سن چکا تھا اور اُنھیں کئی مرتبہ رسالوں میں بھی دیکھ چکا تھا۔ ان کے چچا حضرت دلّی کاکوی بھی دُنیائے ادب میں خاصی وقعت رکھتے ہیں۔

ایم۔ اے فرسٹ ایر کا امتحان ہوا تو ارشدؔ نے اپنے پرچوں سے شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ کے دلوں کو جیت لیا لیکن ان کا کمال فرسٹ کلاس پانے یا لانے میں نہ تھا کیونکہ ان سے پہلے بھی اُردو کے طلبہ فرسٹ کلاس پا چکے تھے اور ان کے بعد بھی ہر سال پاتے رہے ہیں۔ دراصل ارشدؔ کے پرچوں میں جس چیز سے ان کے سب اساتذہ سب سے زیادہ مسرور و متاثر ہوئے وہ ان کا اندازِ بیان تھا جس میں بلا کی شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ وہ بہت تیز لکھتے ہیں لیکن تیز لکھنے کے باوجود اپنے اسلوب کی مخصوص دل آویزی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اس امتحان سے یونیورسٹی کے اندر اور باہر ان کی شہرت اور مقبولیت کا دَور شروع ہوا۔

سچ پُوچھیے تو مقبولیت ارشدؔ کا وہ حصہ ہے جو اُنھیں ہر جگہ ہر حلقے سے ملا کرتا ہے۔ گزشتہ نو دس سال کے اندر ڈھاکا یونیورسٹی کے اُردو طلبہ میں ارشدؔ واحد شخص ہیں جنھیں طالبات میں بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی۔ وہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں بھی ہمیشہ مقبول رہے۔ خصوصاً شادانی صاحب کو تو اتنے عزیز رہے ہیں کہ اُنھوں نے ارشدؔ کی طالب علمی ہی کے زمانے میں اُستادی و شاگردی کے تکلف

کو ایک مدت تک اُٹھا دیا تھا اور دو ایک مرتبہ بغیر کسی دعوت کے ارشد کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے تھے۔ میں ڈھاکا کے دو ایک ایسے معزز خاندانوں سے واقف ہوں جن میں ارشد کی ماں دان گھر کے عزیز ترین فرد کی سی ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ میں ایسے ادیبوں اور شاعروں کو جانتا ہوں جو ہندوستان و پاکستان کے طول و عرض میں مشہور و محترم ہونے کے باوجود ارشد جیسے نوخیز اہلِ قلم سے اس بات کے خواہش مند رہے کہ وہ ان پہ مضمون لکھیں۔ ارشد ایسوں کی آرزو پوری کرنے کے لیے کئی مضمون لکھ بھی چکے ہیں۔ وہ اب تک جن رسالوں میں لکھتے رہے ہیں ان کے پڑھنے والوں میں محبوب رہے ہیں اور ڈھاکے سے باہر جن مشاعروں میں شریک ہوئے ہیں وہاں بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سُنے گئے ہیں۔ اب مشاعروں میں ان کی شرکت صدارت کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ انھیں ایسے اجنبیوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے ــــــ اور ایسا اتفاق ہر اہلِ قلم کے حصے میں کہاں آتا ہے ــــــ جو ان کے بڑے عقیدت مند ہوتے ہیں۔ یہ اور بات کہ ان کی بعض عقیدت مندانہ باتیں خود ارشد کو مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔

ارشد قلم کے دھنی ضرور ہیں مگر زبان کے طرار ہرگز نہیں۔ وہ نہ خوش گفتار ہیں اور نہ خوش تقریر۔ لیکن اپنی ذہانت اور معصوم شرارت کی بنا پہ دوستوں کی محفل میں جانِ محفل بن جاتے ہیں۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا ذوق جو انھیں اپنے والد سے وراثت میں ملا ہے اسے شادانی صاحب کے اثر نے اور بھی چمکا دیا ہے۔ وہ نہ خود 'بور' بنتے ہیں اور نہ 'بور' قسم کے لوگوں کی تاب لا سکتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی 'بور' قسم کے لوگوں سے لطف ضرور اُٹھاتے ہیں۔

ارشد کا حافظہ بڑا قوی ہے۔ اتنا ہی قوی جتنا کہ میرا حافظہ کمزور ہے۔ چنانچہ مجھے اپنے اشعار تک یاد نہیں رہتے اور ارشد کو اپنے اشعار کے علاوہ میرے اور دوسروں کے بھی بہت سے اشعار یاد رہا کرتے ہیں۔ شکر ہے کہ وہ بدنیت نہیں ورنہ اللہ جانتا ہے اور ذہین آدمی سمجھ سکتا ہے کہ وہ میرے اور

دوسروں کے اشعار سے کیا کچھ مصرف لے سکتے تھے۔

ارشد میانہ قد کے دھان پان آدمی ہیں۔ رنگ سانولا ہے۔ چہرہ کتابی اور پیشانی چوڑی۔ نہ ڈاڑھی کے قائل نہ مونچھ کے۔ شیروانی سے زیادہ سوٹ میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن شیروانی ہو یا سوٹ دونوں ان کی نفاست پسندی اور خوش مذاقی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ چال میں ایک عجیب الھڑپن ہے۔ سر کو ایک ذرا ترچھا کیے، زمین پر نظر جمائے، انگلیوں میں کنجیوں کا گچھا نچاتے ہوئے کچھ اس طرح سوچتے اور جھومتے ہوئے چلتے ہیں کہ آپ کا جی چاہے گا ان کے قریب سے یہ مصرع پڑھتے ہوئے گزر جائیں ع

یوں نہ چلئے جھوم کر یہ چال متوالوں کی ہے

ارشد شادی شدہ بھی ہیں اور صاحب اولاد بھی۔ اپنے شادی شدہ ہونے کو وہ اپنے والدین کی غلطی قرار دیتے ہیں اور صاحب اولاد ہونے کو اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ انھیں شادی اور بچوں سے نفرت ہے۔ ان میں ایک اچھا باپ بننے کی صلاحیت موجود ہے بشرطیکہ شادی ان کی پسند کے مطابق ہو اور بچے ایک ناپسندیدہ بیوی کے نہ ہوں۔ ارشد کی بدنصیبی یہ ہے کہ ان کی شادی نہ اُن کی مرضی کا نتیجہ ہے نہ معاشقے کا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان کی بیوی میں نباہ لے جانے والی صلاحیت تو ایک طرف اس جذبے کی پذیرائی تک نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ یہ صورتِ حال ارشد کی سب سے بڑی ٹریجڈی بن کر رہ گئی اور اُن کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے ایک خط میں اپنی ذہنی اذیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"اس وقت میری ہستی یکسر داد طلب ہے۔ سر سے پیر تک قابلِ رحم ہوں۔ میں ان خرافات کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔

لیکن غلط استعمال ہو جانے کا شکوہ کروں بھی تو کس سے۔
میں ان دنوں جن ذہنی پریشانیوں سے دوچار ہوں اُن سے
خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے۔ بغیر پسند یا محبت کی شادی کے
بارے میں شادانی صاحب نے کسی جگہ لکھا ہے کہ یہ کسی یتیم خانے
کا آنریری سکرٹری ہو جانے کے مترادف ہے۔ میرا تجربہ بکسیر
یہی ہے۔ میں اپنے اندر اس کارِ خیر کی اہلیت نہیں پاتا۔"

ارشد طبعاً رومانی اور رند مشرب واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے عاشق کا محبت پرست دل اور رند کی آزادہ رو فطرت پائی ہے۔ اپنی آزادہ روی کے باوجود کسی کا بن جانا اور کسی کو اپنا بنا لینا ان کی افتادِ طبیعت کا سب سے اہم تقاضا ہے جو ان کے بعض معاشقوں کی کامیابی کے باوجود آج تک پورا نہ ہو سکا۔ اس باب میں شادانی صاحب کے دو شعر ارشد پر بھی صادق آتے ہیں ؎

وفا پرست ہیں قادر نہیں وفا پہ مگر
جہاں میں کوئی ہم ایسا بھی نامُراد نہیں

دلائے بر عشق کہ ہو حسن و وفا جو مجبور
کامراں ہوتے ہوئے یوں کوئی ناکام نہ ہو

ارشد میں ایک رند کی خوبیاں اور کمزوریاں دونوں ہیں۔ وہ جہاں دل کے بہت اچھے ہیں وہاں بعض معاملات میں زبان کے کچے بھی ہیں۔ مثلاً وہ آپ سے قرض لیں گے تین دن کے وعدے پر اور ادا کریں گے تین مہینے کے بعد۔ اس تاخیر میں ان کے حالات کی ناسازگاری سے زیادہ ان کے خرچ کے 'فن کارانہ' انداز کو دخل ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فن کارانہ فطرت اپنے ذوق کو اپنی ضرورت

پر ترجیح دیتی ہے ۔ ارشد کی ذات اس خیال کی ایک اچھی مثال ہے ۔

ارشد میں ایک بات عجیب وغریب ہے ۔ وہ ایک خوش حال گھرانے کے فرد ہیں ۔ ناز ونعم میں پرورش پائی ہے ہمیشہ اچھے مکان میں رہتے ، اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے گزری ہے ۔ میرے حالات ان کے برعکس رہے ہیں ، پھر بھی میں ان میں عافیتوں اور سہولتوں سے بے نیازانہ گزر جانے کا حوصلہ اپنے سے زیادہ پاتا ہوں ۔ ارشد کُملاّ سے ڈھاکے آتے ہیں تو اکثر و بیشتر میرے ہی یہاں ٹھہرتے ہیں اور میرے یہاں ٹھہر کر وہ کن راحتوں اور لذتوں کی قربانی کا ثبوت دیتے ہیں یہ میں ہی جانتا ہوں ۔ وہ چاہیں تو ان امیر گھرانوں میں ٹھہر سکتے ہیں جہاں وہ بہت مانے اور چاہے جاتے ہیں ۔ وہ چاہیں تو اپنے سگے بڑے بھائی کے یہاں ٹھہر سکتے ہیں جن کا مکان اپنی آرائش کے اعتبار سے فردوسِ نظر کی حیثیت رکھتا ہے ۔ مگر وہ صاف ستھرے محلے ، اچھے مکان ، پُرسکون ماحول ، بجلی کی روشنی برقی پنکھے ، ریڈیو کے نغمے ، آرام کی نیند ، امیرانہ انداز کے ناشتے اور کھانے پر ترجیح دیتے ہیں میرے گندے محلے کو ، بے ڈھنگے مکان کو ، تکلیف دہ کمرے کو ، لال ٹین کی روشنی کو ، دستی پنکھے کو ، ریڈیائی نغموں کی بجائے رکشا والوں کے شور و شغب کو ، آرام کی نیند کی بجائے مچھروں کے شبخوں کو ، روکھے پھیکے ناشتے اور بے مزہ کھانے کو ۔ اگر میں ارشد کی پوزیشن میں ہوتا تو شاید ہی اپنے آپ کو ایسی قربانی کے لیے آمادہ پاتا ۔ کبھی کبھار وہ کسی اور کے یہاں ٹھہرتے بھی ہیں جب بھی ان کا بیشتر وقت میرے یہاں میرے ساتھ گزرتا ہے ۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ میرے یہاں قیام پذیر ہوتے ہیں تو میں اُن کا میزبان ہوتا ہوں یا وہ میرے ۔ اس لیے کہ میں کھانے پینے میں اُن کے لیے کوئی اہتمام نہیں کرپاتا ۔ عین ناشتے یا کھانے کے دوران اگر ان کا جی چاہا کہ ہوٹل سے فلاں چیز منگالی جائے تو وہ اپنے پیسے دے کر میرے ملازم کو دوڑادیں گے ۔ شام کی چائے ہمیشہ ڈھاکے کے کسی اچھے ریستوراں میں پی جائے گی اور پلانے والے ارشد ہوں گے ۔ اگر کبھی سینما دیکھنے کا

پروگرام بن گیا تو اُس میں بھی خرچ اُن کا ہوگا اور تفریح ہم دونوں کی۔

خط لکھنا ارشد کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ خط لکھنے کی معمولی سی ضرورت نہ بھی نکل آئے تو وہ خط لکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ضروری خط لکھ کر ان کا جی نہیں بھرتا۔ تو غیر ضروری خط لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ لکھنے کے معاملے میں ارشد اہتمام اور کاوش کو ذرا بھی راہ نہیں دیتے۔ جو کچھ لکھتے ہیں قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ پھر بھی ان کے خطوط بہت ہی شگفتہ اور دل آویز ہوتے ہیں۔ ان کے ہر خط میں ایک باغ و بہار شخصیت کی جلوہ گری پائی جاتی ہے۔ ان کے خطوں کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ارشد کے اندر جو فن کار ہے وہ ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط میں جو باتیں کاروباری ہوتی ہیں وہ بھی ادبیت کی چاشنی سے خالی نہیں ہوتیں۔ ایک مرتبہ انھیں کچھ دنوں کے لیے تقریباً سو روپے کی ضرورت آپڑی۔ مجھے خط لکھ بھیجا کہ میں کہیں سے بندوبست کر کے بھیج دوں۔ اُس خط کا تمہیدی حصہ یہ ہے:۔

"جس طرح اس دُنیا میں "ظالم" ہونا بُرا ہے اُسی طرح "مہربان" ہونا بھی ستم ہے وہ دوسروں کے لیے۔ یہ اپنے لیے مجھے افسوس ہے کہ تم کو ایک بار پھر خود پر ستم توڑنا ہے اور میرے لیے زمین سے تارے توڑ لانے ہیں۔"

میرے نام ان کا ایک خط یوں شروع ہوتا ہے۔ "ہم نشین نیک کردار و ندیم نیک نام! القاب لکھنے کو تو لکھ دیا مگر اب سوچتا ہوں کہ یہ الفاظ تم پر چسپاں ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔ نیک نام تو خیر سے تم ہو لیکن تمھارے نیک کردار ہونے کی ضمانت کون لے۔"

تین چار سال ہوئے یونس احمر کلکتہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کا امتحان دے کر یہاں آئے ہوئے تھے۔ ایک دن میں نے ارشد کو یہ خبر سنائی کہ

احمر پاس کر گئے اور اُنھوں نے سکنڈ کلاس پایا۔ ارشد نے یہ خبر سُنتے ہی مجھ سے کاغذ کا ایک ٹکڑا لیا اور احمر کے نام ایک رُقعہ لکھ کر مجھے دے دیا کہ اُن تک پہنچا دوں۔ اس رُقعے کے جملے کچھ اس قسم کے تھے۔

"احمر۔ ایم۔ اے کی کامیابی مبارک۔ لیکن یہ خبر تو میں نے نظیر سے سُنی ہے۔ تم کب سناتے ہو؟ یہ یاد رہے کہ میں تمھاری شیریں بیانی کا قائل ہوں۔ "ارشد"

دو تین سال اُدھر کی بات ہے ہندوستان اور پاکستان کی بعض یونیورسٹیوں سے کچھ لوگ جنھیں ارشد اور میں دونوں جانتے ہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونی ممالک جارہے تھے۔ ارشد نے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔

"..... صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی کے سلسلے میں لندن روانہ ہو گئے..... صاحبہ عمرانیات میں ایم۔ اے کرنے کے لیے ہیگ جارہی ہیں..... صاحب فلاں موضوع پر کام کرنے کے لیے مصر جانے والے ہیں۔ لیکن میری تمھاری قسمت میں سفرِ آخرت کے سوا اور کوئی سفر نہیں ہے"

لکچرشپ ارشد کا وہ محبوب ترین پیشہ ہے جس کی خاطر وہ اپنے بعض دوستوں اور بہی خواہوں کے اصرار کے باوجود CENTRAL SUPERIOR STUDIES کے امتحان میں شریک نہ ہوئے۔ گزشتہ چار سال سے وہ وکٹوریا کالج کملاّ میں اُردو کے لکچرر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ یہ کالج مشرقی پاکستان کے بہترین کالجوں میں شمار کیا جاتا ہے اور کملاّ مشرقی پاکستان کے چند حسین ترین مقامات میں سے ہے۔ ارشد پہلے ڈھاکا چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے اور اب کملاّ چھوڑنے پر آمادہ نہیں، یہ اور بات ہے کہ حالات یا سود و زیاں کا تصور جس کو جہاں چاہتا ہے لے ہی جاتا ہے۔

۱۹۵۶ء

ارشد کاکوی کے کچھ اشعار

تمھارے ہونٹوں پہ کانپتی ہے ہمارے کانوں میں گونجتی ہے
جو بات تم نے کہی نہیں ہے جو بات ہم نے سنی نہیں ہے

وہ کوئی ہوگا سبک سر ہی جس نے زیست کہا
یہ زیست ویست نہیں دردِ سر ہے دردِ سر

کیسے کرتے ہو تم اللہ کا شکوہ ارشد — اس نے کیا کچھ نہ دیا تم کو مسرت کے سوا

غریب آدم کو زندگی میں بھی زندہ رہنے سے روکتے ہو
تو پھر یہ منطق سمجھ سے باہر ہے اس کی قسمت میں موت بھی ہے

نہ ہنسنے دے نہ رونے دے نہ جینے دے نہ مرنے دے
اسی کو اصطلاحاً ہم زمانہ کہتے آئے ہیں

راہِ حیات یوں تو بہت خاردار ہے — تم ساتھ دے سکو تو سفر خوش گوار ہے

جو مجسم خوشی تھے تمھارے لیے تم سراپا محبت تھے جن کے لیے
اب مروت کے بھی مستحق وہ نہیں کیا اب اتنے بھی ارشد برے ہو گئے

مجھے تم اچھے لگے ہیں سنے کہہ دیا تم سے — عجیب ہے مری فطرت کی سادگی اے دوست

کھُلا یہ راز جب آئے وہ بال بکھرائے
کہ روشنی سے زیادہ حسین ہیں سائے

آپ اس سے تلوار بنائیں اور ہم اس سے ڈھال
کون بتائے کس کے باعث لوہے کا ہے کال

جانے نجومی کیا کچھ کہتا اور بھی کڑھتے ہم
ہم نے نذرانہ پیسے دے کر جانے اچھے حال

صادق القادری

غالباً ۱۹۵۱ء میں چاٹگام میں مشاعرہ تھا۔ ڈھاکے سے بلائے جانے والے شعرا ایک ساتھ چاٹگام روانہ ہو رہے تھے۔ اس قافلے میں صادق بھی تھا جو بخار میں مبتلا ہونے کے باوجود جاڑوں کے موسم میں رات کی گاڑی سے ہم لوگوں کے ساتھ چاٹگام جارہا تھا۔ اس وقت تک میرے اور صادق کے مراسم جان پہچان تک محدود تھے۔ میں نے اسے ڈھاکے کی ایک ادبی انجمن میں ایک دو مرتبہ غزل پڑھتے سنا تھا۔ اس کا ایک شعر مجھے بہت پسند آیا تھا۔ پھر بھی اس کی ذات یا اس کی شاعری میری دلچسپی کا باعث نہ بن سکی تھی۔ بیماری کی حالت میں اس کے سفر کرنے سے مجھے بڑی کوفت ہوئی اور جب کسی نے چپکے سے میرے کان میں کہا کہ صادق کو اکثر حرارت رہا کرتی ہے اور کبھی کبھی منہ سے خون بھی آجاتا ہے تو میری کوفت اس غصے میں تبدیل ہو گئی کہ اتنے دور دراز کے مشاعرے میں مریض و مدقوق شاعر کی شرکت کیا ضرور۔ اب میں ڈھاکا اسٹیشن ہی سے اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ جہاں تک ممکن ہو صادق سے دور رہوں۔ چاٹگام پہنچ کر صادق کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہو گئی۔ پھر بھی وہ کمبل اوڑھ کر مشاعرے میں شریک ہونے سے باز نہ رہا۔ جب اس کے پڑھنے کی باری آئی تو اس نے پہلے کچھ رباعیات اور قطعات سنائے

اور آخر میں غزل۔ وہ ترنم سے پڑھتا تھا اور جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں میں اسے ایک، دو مرتبہ غزل پڑھتے سن چکا تھا لیکن اس سے مجھے نہ تو اس کے کلام کی دل دوزی کا پوری طرح اندازہ ہو سکا تھا نہ اس کے ترنم کی دل آویزی کا۔ چاٹگام کے مشاعرے میں علالت کے باوجود اس کا ترنم بہت ہی دل پذیر تھا اور اس کے اشعار سب کے سب بڑے درد آگیں۔ اس کے اشعار کے درد و کرب اور ترنم کے سوز و گداز نے میرے دل و دماغ میں نہ صرف قیامت برپا کر دی بلکہ مجھے اس کی قربت حاصل کرنے کا آرزومند بھی بنا دیا۔ شاید مشاعرے ہی میں میرے اس کے درمیان یہ بات طے پا گئی کہ ڈھاکہ واپس پہنچنے کے دوسرے ہی دن وہ صبح کا ناشتہ میرے ساتھ کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یا تو میں اس کے قریب جانے سے احتراز کر رہا تھا یا پھر میں اپنے آپ کو اس کا ہم پیالہ و ہم نوالہ پا کر خوش ہو رہا تھا۔

اس دن سے صادق اکثر میرے یہاں آنے لگا۔ ہم دونوں بہت جلد "آپ" سے "تم" تک پہنچ گئے۔ اس میں تکلف اور تمکنت ذرا بھی نہ تھی۔ وہ پیٹ کا ہلکا تو نہ تھا لیکن اپنے کسی دوست کو اپنا راز دار بنانے کے لیے اس بات کا منتظر نہیں رہتا تھا کہ پہلے خود اس کو راز دار بنا لیا جائے۔ اس نے باتوں باتوں میں اپنی زندگی کے کئی راز میرے سپرد کر دیئے اور یہ تاکید کبھی نہیں کی کہ اسے اپنے ہی تک رکھنا۔ دوستی کے معاملے میں وہ صرف اعتماد کا قائل تھا۔ احتیاط کا نہیں۔

صادق کا آبائی وطن مرشد آباد تھا۔ لیکن اس کی پیدائش رنگون[1] میں

---

[1] صادق ۲۵ جنوری ۱۹۲۶ء کو رنگون میں پیدا ہوا جہاں اس کے والد ملازمت کرتے تھے ۹ مہینے کی عمر میں کلکتے لے آیا گیا۔ ابتدائی تعلیم کلکتے کے ایک انگریزی اسکول سے حاصل کی۔ اپنی ذہانت کی بدولت امتحان میں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

ہوئی اور پرورش و پرداخت کلکتے میں۔ ہر بڑے شہر کی طرح کلکتے کی بھی ایک اپنی تہذیب ہے جس کے اثرات اور عناصر صادق کی ذات میں دیکھے جا سکتے تھے۔ اس کے ادبی ذوق کی پاکیزگی میں شک نہیں لیکن وہ شعر و ادب کا سنجیدہ طالب علم نہ تھا۔ اردو کے غزل گو شاعروں میں میں نے اسے شاد عظیم آبادی کا مداح پایا۔ اپنی شاعری کی ابتدائی دور میں صادق نے ابر احسنی کی شاگردی اختیار کر لی تھی لیکن جب استاد نے اس کے اس شعر پر ؎

بات یہ اور ہے کہنے نہ دے پاسِ وفا
آپ کے جور سے تکلیف مگر ہوتی ہے

یہ اعتراض کیا کہ غزل میں اس قسم کا مضمون غزل کی روایت کے خلاف ہے تو اس نے ان سے اصلاح لینا ترک کر دی اور انھیں لکھ بھیجا کہ میں روایت پر حقیقت کو قربان نہیں کر سکتا۔

ابر احسنی سے ترکِ تعلق کے بعد اس نے کسی اور سے اصلاح نہیں لی جب میرے اس کے مراسم گہرے تعلقات میں تبدیل ہو گئے تو ہر ملاقات میں اپنا تازہ کلام سنا کر میری رائے ضرور طلب کرتا۔ اگر میں کوئی ترمیم پیش کرتا تو اسے قبول بھی کر لیتا۔ خود میں نے بھی کئی مرتبہ اس کے مشورے کے مطابق اپنے اشعار میں ترمیم

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) ہمیشہ اول یا دوم آتا۔ ۱۹۴۴ء میں کلکتہ مدرسے سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۴ - ۴۸ء تک اسلامیہ کالج کلکتہ سے آئی اے اور بی۔ اے کی تکمیل کی۔ ۱۹۵۰ء میں کلکتے سے اپنے خاندان کے ساتھ ڈھاکے چلا آیا۔ یہاں پاکستان میں پی اینڈ ٹی آڈٹ آفس میں کلرک کی حیثیت سے ملازم رہا۔ ۵۲ء میں شادی کی۔ ۵۴ء سے اس کی صحت زیادہ خراب رہنے لگی۔ ۱۰ اکتوبر ۵۷ء کی شب کو کلکتے میں وفات پائی۔

کی ہے۔

صادق کو زود گوئی اور بدیہہ گوئی دونوں پر خاصی قدرت تھی۔ میں نے کئی مرتبہ کم سے کم وقت میں اسے مشاعرے یا ریڈیو کے لیے نظمیں لکھتے دیکھا اور کئی موقعوں پر فی البدیہہ شعر کہتے پایا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس کے فی البدیہہ شعر محفوظ نہیں کیے۔ البتہ ایک شعر کا ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ ایک دفعہ طویل وقفے کے بعد وہ مجھ سے ملنے آیا۔ میں گھر پر موجود نہیں تھا۔ وہ ایک شعر لکھ کر چھوڑ گیا۔ جس کا دوسرا مصرع یہ ہے ؎

تم سے ملے ہوئے تو زمانہ گذر گیا

اس کا حافظہ غیر معمولی تو نہیں قوی ضرور تھا۔ دوسروں کے جو شعر اسے پسند تھے وہ اسے ہمیشہ یاد رہتے۔ اپنے اشعار کی بیاض اس نے میرے اصرار سے بنائی لیکن اس میں اس نے اپنے تمام اشعار منتقل نہیں کیے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے اشعار اس کے ساتھ دفن ہو گئے۔

صادق میں اکتسابی قوت بلا کی تھی۔ اپنی مترنم آواز کی بنا پر اسے گانے کے فن سے خاص لگاؤ تھا۔ اگرچہ اس نے اس فن کو کسی ماہر فن سے باقاعدگی کے ساتھ نہیں سیکھا تھا پھر بھی وہ کئی دھنوں اور راگوں سے واقف تھا۔ فلم کے گانے خواہ وہ کسی دھن میں ہوں ان کو وہ ایک مرتبہ سن کر اسی دھن میں سنا دیتا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے جن مشہور شاعروں کو اس نے ترنم سے پڑھتے سنا تھا ان کی مکمل نقالی پر اسے پوری قدرت تھی۔ لیکن اپنی اس صلاحیت کے باوجود وہ اپنا کلام نہ تو فلمی گانوں کی دھن میں پڑھتا تھا اور نہ کسی مشہور شاعر کے طرز میں۔ اس کے پڑھنے کا انداز سو فیصد شاعرانہ بھی تھا اور انفرادی بھی۔

صادق غزل، قطعہ اور رباعی کا شاعر تھا۔ کبھی کبھار گیت بھی لکھتا تھا۔

اور افسانے (میں نے اس کا کوئی افسانہ نہیں پڑھا) بھی۔ میں نے اس کے دو ایک گیت خود اس کی زبان سے سُنے تھے اور وہ گیت مجھے بہت پسند آئے تھے۔

صادق شگفتہ مزاج بھی تھا اور حاضر جواب بھی ــــ زندگی کی سختیوں اور تلخیوں نے اسے مار رکھا تھا۔ پھر بھی صحبتوں اور محفلوں میں ہنستے ہنساتے پایا گیا۔ اسے لطیفوں سے لطف اندوز ہونا بھی آتا تھا اور لطیفوں کو سلیقے سے بیان کرنا بھی۔ گفتگو اور تحریر (میری مراد نثر سے ہے شاعری سے نہیں) دونوں میں رعایت لفظی اور ذو معنی الفاظ (PUNS) سے فائدہ اُٹھانے کا بڑا عادی تھا یہاں تک کہ اپنی وفات سے دو روز قبل اس نے جو خط اپنی بہن کے نام بھیجا اس میں بھی ذو معنی الفاظ سے کام لیے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنے مرض کی تشخیص کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آپ کو ٹی بی بہت کم ہے اور اس کی کوئی فکر نہیں لیکن آپ کا دل بہت بڑھ گیا ہے ــــ بہرحال دل بڑھ گیا ہے تو اچھی بات ہے۔ جلد کب کسی کا دل بڑھتا ہے۔

صادق کی حاضر جوابی حسبِ موقع مزاحیہ بھی ہوتی اور طنزیہ بھی ــ ایک مرتبہ بیگم حیدر زمان (ان کا ذکر آگے آئے گا) کے یہاں نشست تھی۔ صادق بھی موجود تھا۔ اس نشست میں ایک شاعر ایسے بھی تھے جن سے دوسری تیسری غزل پڑھنے کی فرمائش کی جاتی تو کبھی اس فرمائش کو رد نہ کرتے لیکن اُنھیں یہ گوارا نہ تھا کہ اس قسم کی فرمائش جو شاعر کی مقبولیت کا ثبوت ہے صادق سے بھی کی جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے بڑے دوستانہ لہجے میں صادق سے کہا کہ اگر آپ سے دوبارہ پڑھنے کو کہا جائے تو انکار کر دیجیے۔ آخر ہم لوگ شاعر ہیں یا اربابِ نشاط ــ صادق ان کی نیت اور ذہنیت دونوں سے واقف تھا۔ اس نے کہا آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن کیا کروں جس طرح آپ اخلاقاً مجبور ہو جاتے ہیں، میں بھی اخلاقاً مجبور ہو جاتا ہوں۔

تحریر ہو یا تقریر اپنے مافی الضمیر کا اظہار آسان نہیں۔ اس لیے بہت سے تعلیم یافتہ لوگ اپنی مادری زبان میں بھی روانی کے ساتھ نہیں بول پاتے۔ لیکن صادق

اردو، انگریزی اور بنگلہ تینوں زبانوں میں رواں تھا۔ میں نے اسے ان تینوں زبانوں میں یکساں سہولت اور سلاست کے ساتھ گفتگو کرتے پایا۔ ایک مرتبہ اس کے ساتھ ایک انگریزی فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں انگریزی فلم کا مکالمہ سمجھنے میں بہت بودا واقع ہوا ہوں۔ میرے کان ابھی تک انگریزی لہجے سے مانوس نہیں ہو سکے لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میری طرح فلم کم دیکھنے ــــــــــ

ــــــــــ کے باوجود صادق کو اس فلم کے سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ فلم دیکھنے کے بعد اس نے مجھے فلم کی پوری کہانی بھی بتائی اور مکالمے کے کئی اچھے جملے بھی سنائے۔

صادق کی زبوں حالی کے ہاتھوں اس کی خودداری ہمیشہ کشمکش میں مبتلا رہی۔ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ ایک مرتبہ شہر کے ایک بڑے دولت مند صاحبِ تجارت نے اپنے یہاں ایک نشست کی۔ اس میں صادق بھی شریک تھا۔ اس وقت تک صادق کی صحت خراب ہو چکی تھی اور ایک مشہور ڈاکٹر کی تشخیص کے مطابق وہ تپِ دق میں مبتلا ہو چکا تھا اور بظاہر مدقوق بھی معلوم ہوتا تھا۔ تاہم وہ ملازمت بھی کرتا تھا اور چھوٹے بڑے ہر قسم کے مشاعروں میں شریک بھی ہوتا تھا۔ اس نشست میں صاحبِ خانہ کو صادق کا نہ صرف کلام پسند آیا بلکہ اس کے حالِ زار پر رحم بھی آیا۔ چنانچہ نشست کے بعد انھوں نے صادق کے ایک دوست سے جو ان کے دفتری ملازمین میں سے تھا کہا کہ اگر صادق صاحب گوارا کرتے تو میں اُن کا علاج کرا دیتا۔ جب صادق کو ان کا یہ خیال معلوم ہوا تو میں نے اسے اس فکر میں مبتلا پایا کہ اگر وہ میرے علاج کے لیے واقعی آمادہ ہو جائیں تو مجھے ان کے روپے سے علاج کرانا چاہیے یا نہیں۔ ایسا کرنے میں میری خودداری مجروح ہوگی کہ نہیں۔ چونکہ مجھے اس کی خودداری سے زیادہ اس کی صحت اور اس کی زندگی عزیز تھی اس لیے میں نے اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ تم جن حالات سے گزر رہے ہو ان میں خودداری وداری کا سوال اُٹھانا بے معنی ہے۔

اگر وہ تمہارا علاج کرانے پر آمادہ ہوں تو ان کی اس پیشکش کو قبول کر لو۔ لیکن چونکہ ان صاحب کی ہمدردی سرتاسر ہنگامی تھی اس لیے بات آئی گئی ہو گی۔

گزشتہ تین سال سے اندر صادق کے مرض نے کئی مرتبہ ایسی شدت اختیار کی کہ اسے بغیر تنخواہ کے طویل چھٹیاں لینی پڑیں۔ ان چھٹیوں کی بدولت ایک دفعہ اس کی مالی حالت صد درجہ خراب ہو گئی۔ اس نے کئی مرتبہ اشارے کنائے میں مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کے علاج کے لیے پبلک سے چندے کی درخواست کروں۔ چونکہ وہ کوئی بہت مشہور شاعر نہ تھا اس لیے مجھے اس درخواست کے کارگر ہونے میں شبہ تھا جب اس کی مالی بے بسی انتہا کو پہنچ گئی تو اس نے صاف لفظوں میں میرے پاس پیغام بھیجا کہ میں اس کے لیے چندے کے ذریعے کچھ روپے کسی طرح فراہم کروں۔ میں نے اپنے دوستوں اور صادق کے قدردانوں سے چندہ جمع کرنے کی کوشش کی تو بمشکل ۷۵ روپے وصول کر سکا۔ جب میں نے یہ رقم اس کے حوالے کی تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا نظیر! اس وقت اپنا ہی ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

وقت انسان کو کر دیتا ہے کتنا مجبور
منت غیر اُٹھانا ہوں گوارا نہ سہی

وفات سے چند ماہ قبل جب وہ تپ دق کے علاج کی غرض سے مثفورد ہاسپیٹل میں داخل کیا گیا تو اس کی حالت بڑی اندیشہ ناک تھی۔ شادانی صاحب اس کی شاعری کے قدردانوں میں ہیں۔ چنانچہ برابر اس کا حال پوچھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ میرے ساتھ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک اس کے پاس بیٹھے ایسی باتیں کرتے رہے جس سے اس کو تسکین و تقویت مل سکے۔ عیادت کے دو تین دن بعد اُنھوں نے ازراہ امداد کچھ روپے میرے

حافظ صادق کو بھیجے۔ جب میں نے اسے روپے دیئے تو اس نے اسے قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی میرے کہنے پر اس نے روپے رکھ لیے۔ مالی امداد کا وہ شدت کے ساتھ خواہش مند رہا کرتا تھا لیکن جہاں تک میرا اندازہ ہے مالی امداد پاکر اسے خوشی ہرگز نہیں ہوتی تھی۔ ایسے موقع پر اسے اپنی مجروح خودداری یاد آجاتی۔

ڈھاکے کے اونچے طبقے کے لوگوں میں بیگم حیدر (اسٹیٹ بنک ڈھاکا کے سابق منیجر مسٹر لقمان حیدر کی بیگم) صادق پر بہت مہربان تھیں۔ وہ شعر و سخن کی بڑی دلدادہ تھیں ان کے یہاں ہر دوسرے تیسرے مہینے ایک نشست ضرور منعقد ہوتی تھی۔ ان کی تقریباً ہر نشست میں صادق ضرور مدعو ہوتا یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات وہ شریک نہ ہو پاتا۔ جب پہلی مرتبہ ایک ٹی بی ہسپتال میں صادق کے داخلے کا سوال پیدا ہوا تو پتہ چلا کہ داخلہ بغیر رسوخ و رشوت کے ممکن نہیں۔ اس معرکے کی ساری دشواریاں بیگم حیدر ہی کی مدد سے آسان ہوئیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ صادق کے داخلے سے پہلے بھی کئی دفعہ انھوں نے کسی نہ کسی حد تک اس کی مدد کی تھی ان کی یہ ساری مدد صادق کی شاعری سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھی۔ وہ خود بھی شعر کہتی ہیں کبھی کبھار اپنے اشعار کے متعلق صادق سے مشورہ بھی کر لیتی تھیں۔ صادق صرف شاعر تھا۔ استاد نہ تھا یاایں ہمہ نوجوان شعرا اس سے باقاعدگی کے ساتھ اصلاح بھی لیتے تھے۔

صادق مریض اور مفلوک الحال ہونے کے باوجود شادی کرنے سے باز نہ رہا۔ میں اس کا قائل رہا ہوں کہ جس شخص کو جسمانی صحت اور مالی فراغت نصیب نہ ہو اسے شادی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں نے صادق کو یہ بات سمجھانا چاہی تو وہ یہ عذر پیش کرنے لگا کہ میں شادی داداجان کے اصرار سے کر رہا ہوں۔ انھیں میرا سہرا دیکھنے کی بڑی تمنا ہے۔ اس عذر کی صداقت پر یقین کرنے کے باوجود میں صادق کو شادی نہ کرنے کی ترغیب دیتا رہا کیونکہ دادے اور دادیاں اپنی تمنا

پوری کے دُنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں اور اگر رخصت نہ بھی ہوں جب بھی شادی کا خمیازہ شادی کرنے والے ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ لیکن صادق پر میرے دلائل کا جادو نہ چل سکا۔ اس نے شادی کر لی اور اس طرح اپنی پریشانیوں میں جو پہلے ہی کچھ کم نہ تھیں اور اضافہ کر لیا۔ اس کی بیوی ایک امیر اور رئیس گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے والد صادق اور اس کے گھر والوں کے اخلاق سے متاثر ہو گئے اور اس کی مالی حالت کا صحیح اندازہ کرنا بھول گئے۔ لیکن چونکہ صادق کی بیوی نہایت ہی صابر و شاکر واقع ہوئی تھی اس لیے بڑے صبر و ضبط کے ساتھ صادق کے دُکھ درد کا ساتھ دیے گئی ہیں نے صادق کو اس کی رفاقت کا مداح بھی پایا اور اس خیال سے مغموم بھی کہ وہ اپنی بیوی کے لیے کچھ نہ کر سکا۔

شادی کے دو ہی سال بعد صادق کی بیوی دو بچیوں کو چھوڑ کر اس دُنیا سے چل بسی۔ صادق اپنی دونوں بچیوں کو بہت عزیز رکھتا تھا —— دو معصوم بچیاں جو اب تک یہ سمجھ رہی ہیں کہ ان کا باپ ایک دن سفر سے واپس آ جائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ شادی کے بعد آدمی اپنے والدین کو بھول جاتا ہے اور اولاد کی پیدائش کے بعد اپنے آپ کو۔ صادق اپنے آپ کو شادی سے پہلے ہی بھول چکا تھا۔ اور اپنے والدین اور بھائی بہنوں کو اولاد کی پیدائش کے بعد بھی نہ بھول سکا۔ بوڑھے اور بیمار ماں باپ کا علاج، بہنوں کی شادی، چھوٹے بھائیوں کی تعلیم، ان میں سے ہر ایک کے کپڑے لتے کی فکر، چڑھتے ہوئے قرض اور بڑھتے ہوئے سود کی ادائیگی، ہر ایک کے جسم و جاں کے باہمی تعلق کو برقرار رکھنے کے لیے دال روٹی کا انتظام یہی وہ مسائل تھے جن سے صادق کی زندگی شادی سے پہلے بھی عبارت تھی اور شادی کے بعد بھی انہی مسائل کو حل کرنے کے لیے وہ اپنی بیماری کے سخت سے سخت دورے کے بعد بھی کسی قدر صحت یاب ہوتے ہی دفتر جانے لگتا تھا۔ انہی مسائل نے نہ تو اسے عافیت کی زندگی بسر کرنے دی اور نہ سکون کی موت مرنے دیا۔

جیسے جیسے صادق کی زندگی کی تلخیاں بڑھتی گئیں اس کی شخصیت طنز

میں تبدیل ہوتی گئی۔ ایک ایسی طنز جو لفظوں سے زیادہ تبسم میں ظاہر ہوتی تھی جب کبھی اور جہاں کہیں صادق کو مایوسی ہوتی یا اسے مایوسی کا اظہار مقصود ہوتا تو وہ ایک خاص انداز سے مسکرانے لگتا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس مسکراہٹ میں کتنی چبھن تھی۔

صادق کے مزاج میں مذہبیت خاصی تھی۔ خاندانی ماحول کے اثر سے ایک بزرگ کے ہاتھ پر بیعت بھی کر چکا تھا۔ بایں ہمہ نماز روزے کا پابند نہ تھا بلکہ بعض ممنوعہ افعال کی لذتوں سے بھی ناآشنا نہ تھا۔ البتہ وفات سے ایک ڈیڑھ سال قبل اس پر مذہبیت بڑی شدت کے ساتھ طاری ہوگئی تھی۔ اس نے پنج وقتہ نماز شروع کر دی تھی کچھ عرصے تک اپنے علاج کے باب میں دوا سے زیادہ ایک مقامی بزرگ کی دُعا اور تعویذ پر بھروسا کرنے لگا تھا۔ اس زمانے میں وہ پیغمبروں، ولیوں اور صوفیوں کی زندگی کے حالات وواقعات، ان کے اخلاق وعادات، ان کے معجزوں اور کرامتوں کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتا اور مجھ سے گفتگو کرتے وقت کسی نہ کسی عنوان سے ان کا ذکر چھیڑ دیتا۔ وہ ناقابلِ یقین روایتوں پر بھی ناقابلِ شکست یقین رکھتا تھا۔ اس کی باتیں سن کر میں مسکرا پڑتا تو وہ مجھے مسلمان بننے کی ترغیب دینے لگتا۔ اس نے مجھے ہمیشہ ملحد سمجھا اور اپنے دلائل سے مجھے مسلمان بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے مجھ سے بارہا کہا کہ نظیر! تم نماز پڑھو اور پیغمبروں اور ولیوں کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرو تو تمھارے دماغ کو بھی بڑا سکون ملے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے ذہنی سکون ہی کی خاطر مذہب میں پناہ لی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ مجھ سے کہا کہ اگر موجودہ حالات میں مجھے مذہب نے سہارا نہ دیا ہوتا تو میں پاگل ہو جاتا۔ اس زمانے سے اس کی مذہبیت اس کی شاعری پر بھی اثر انداز ہونے لگی۔ اس کا رنگِ تغزل ماند پڑتا گیا اور بے جان تصوف اس کی شاعری پر غالب آتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی نماز کا سلسلہ ٹوٹ گیا مگر اس کی شاعری پر تصوف کا عمل دخل باقی رہ گیا۔ میں نے اس

کی شاعری کے اس نئے میلان کی بڑی مخالفت کی مگر بے سود۔

صادق نے مشاعروں میں شرکت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ بعض اوقات وہ ڈھاکے سے باہر کے مشاعروں میں بھی بلایا جاتا تھا۔ اپنی مترنم آواز اور اپنے مؤثر کلام کی بنا پر وہ مشاعروں میں بہت مقبول ہوتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ ڈھاکے کے ایک بڑے مشاعرے میں اسے ہوٹنگ کا بھی سامنا کرنا پڑا اس دن مشاعرے کی فضا پہلے ہی سے خراب تھی۔ سامعین کا ایک حصہ صرف ہوٹنگ کی غرض سے مشاعرے میں آیا تھا۔ صرف ان شعراء کی آبرو محفوظ تھی جن کا ترنم بہت اچھا تھا۔ اس زمانے میں مسلسل علالت کے باعث صادق کے ترنم کی دلکشی کم ہو چلی تھی۔ پھر وہ جس ہیئت اور حلیئے میں مائیک کے سامنے آیا وہ شاعر سے زیادہ مریض کی ترجمانی کر رہا تھا۔ ہوٹنگ کرنے والوں کو فقرہ بازی کے لیے مواد مل گیا۔ نتیجتاً صادق اپنی غزل ختم کرنے سے پہلے بیٹھ رہا۔

وہ چائے اور پان کا بڑا شائق تھا۔ پان میں تمباکو کھانے کی بھی عادت تھی۔ جو لوگ اس سے اس کے گھر پر ملتے انھیں چائے اور پان ضرور پیش کرتا۔ چونکہ اس کے مرض پر ٹی بی کا شبہ تھا اس لیے بعض احباب اس کے ہاں چائے پینے اور پان کھانے سے پہلو بچاتے۔ لیکن وہ چائے پلانے اور پان کھلانے کے درپے ہو جاتا۔ اس اخلاق یا اخلاقی اصرار کی بنا پر بعضوں نے اس کے یہاں جانا کم کر دیا۔ لیکن یہ بات اسے کس طرح بتائی جاتی یا سمجھائی جاتی کہ مریضوں خصوصاً ٹی بی کے مریضوں کا اتنا متواضع ہونا دوسروں کے حق میں مصیبت کا باعث بن جاتا ہے۔

صادق فی الواقع صدق و صفا اور مہر و وفا کا پیکر تھا۔ اس کے خلوص میں آمیزش نہیں ہوتی تھی۔ حالات نے اس کو ہمدردی اور دوستوں کی مدد کا محتاج بنا دیا تھا۔ لیکن خود اس کے دل میں اپنے ہمدردوں اور دوستوں کی مدد کا جذبہ شدت کے ساتھ موجود تھا۔ تنگ دستی نے اس کی انسانیت پرستی

اور دوست نوازی کو پورے طور پر ظاہر ہونے کا موقع نہیں دیا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو اس کے احباب اس کے ساتھ ویسا خلوص نہ برت سکے جیسا خلوص اپنے احباب کے لیے اس کے دل میں تھا۔ یہاں لفظ احباب میں خود میری ذات بھی شامل ہے۔

صادق کا مرض ڈاکٹروں کے لیے ایک مختلف فیہ مسئلہ بنا رہا۔ ایک مدت تک اسے تپ دق میں مبتلا سمجھا گیا۔ بظاہر علامتیں اسی کی تھیں۔ کھانسی ہوتی تھی۔ منہ سے خون آتا تھا۔ حرارت رہا کرتی تھی۔ سانس تیز چلتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ٹی بی اسپتال میں اور ایک مرتبہ ایک عام اسپتال کے ٹی بی سیکشن میں داخل کیا گیا لیکن دونوں جگہ طویل تشخیص کے بعد ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ تپ دق نہیں ہے۔ پھر کرونک بیرون کائٹس تجویز ہوا۔ کلکتے کے ڈاکٹروں کی تشخیص یہ تھی کہ تپ دق بہت کم ہے البتہ دل بہت بڑھ گیا ہے۔ بہر حال ان میں سے جو مرض بھی رہا ہو اور وہ مرض بجائے خود خطرناک ہو یا نہیں لیکن کلکتہ جانے سے پہلے صادق خطرناک حالتوں سے یقیناً گزر رہا تھا۔ وفات سے ایک دو ماہ قبل اس کے جسم کے نچلے حصے میں ورم بھی آگیا تھا۔ اس علامت کو دیکھ اور سن کر اس کے کئی جاننے والے اس کی زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے۔ لیکن میں نے صادق کو اپنی زندگی کی طرف سے مایوس ہوتے کبھی نہیں دیکھا۔ مرض کے شدائد کے باوجود اس کی زبان سے یہ بات کبھی سننے میں نہیں آئی کہ اب شاید ہی بچ سکوں۔ وہ ہمیشہ علاج اور طریق علاج کے متعلق باتیں کرتا، افاقے کا حال بتاتا اور کبھی کبھار اپنے وزن میں اضافے کی خبر سناتا۔ اس نے اپنی صحت یابی کی اُمید کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ میں کیا بتاؤں کہ اس میں زندہ رہنے کی خواہش کتنی شدید تھی۔ عجیب بات ہے کہ جو لوگ اُٹھتے بیٹھتے موت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں اُنھیں موت نہیں ملتی اور جو لوگ زندگی کے سارے دُہرکو پی کر بھی اس سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں ان سے زندگی چھین لی جاتی ہے۔

صادق کی موت کا ایک دردناک پہلو یہ ہے کہ جب وہ پاکستان آیا ہمیشہ

اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ رہا لیکن اس کی وفات اپنے تمام اعزہ و اقربا سے دُور کلکتے میں ہوئی جہاں وہ علاج کے لیے گیا تھا۔ پھر بھی کلکتہ اس کے لیے دیارِ غیر نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ اس کے جنازے میں تقریباً پانچ سو آدمی شریک تھے۔ ڈھاکے میں یہ شرف وحشت کلکتوی کو بھی نصیب نہ ہو سکا اور اگر صادق یہاں مرتا تو اسے بھی نصیب نہ ہوتا۔ جب وہ ڈھاکے میں صاحبِ فراش تھا تو بہت سے احباب اس کی عیادت تک کو نہیں جاتے تھے اور آخر آخر تک نہیں گئے یہاں تک کہ وہ ڈھاکے سے کلکتے اور کلکتے سے وہاں چلا گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

۱۹۵۸ء

صادق القادری کے چند اشعار

نہ پوچھ کیسے گزرتی ہے زندگی اے دوست
بڑی طویل کہانی ہے پھر کبھی اے دوست

ہمیشہ آتے رہے تغیر ورق الٹتا رہا زمانہ
کبھی فسانہ بنا حقیقت کبھی حقیقت بنی فسانہ
غم محبت کو دل نے سمجھا تھا سہل جیسے غم زمانہ
مگر اٹھایا یہ بوجھ میں نے تو جھک گیا زندگی کا شانہ
ہم اپنی روداد کیا سنائیں کچھ اس میں ہیں واقعات ایسے
اگر کوئی دوسرا سناتا ہمیں سمجھتے اسے فسانہ

اک تبسم کی ہے حقیقت کیا
مگر اس کی سزا بہت کچھ ہے
کوئی شئے حسب مدعا نہ ملی
اور تو نے دیا بہت کچھ ہے
درد دل کا کوئی علاج نہیں
درد دل کی دوا بہت کچھ ہے

دل بجھا یوں کہ زمانے کو خبر تک نہ ہوئی
شمع بجھتی ہے تو محفل میں دھواں ہوتا ہے

ہم سے نہ بدلی جائے گی ہر گام پر روش
ہم کیا کریں زمانے کی رفتار دیکھ کر

کچھ اس طرح شریک تری انجمن میں ہوں
محسوس ہو رہی ہے خود اپنی کمی مجھے

رباعی

یہ صبح رہے شام رہے میں نہ رہوں
یہ گردش ایام رہے میں نہ رہوں
میں کل کا بھروسا نہیں کرتا ساقی
ممکن ہے کہ کل جام رہے میں نہ رہوں

شکیل ملک

اب تو شاید آپ اس سانحے کو بھول بھی چکے ہوں گے۔ لیکن وہ سانحہ بھلا دیئے جانے کا مستحق تو نہیں ہے۔

کون سا سانحہ؟ وہی ۹ رمئی ۱۹۶۸ء کی شام کا سانحہ جس میں ایک بے قصور معصوم اٹھارہ سالہ نوجوان شکیل سکنڈ ایر آئی ایس سی کے فائنل امتحان کے ایک پرچے سے فارغ ہونے کے بعد امتحان گاہ سے نکلتے وقت رائفل کی گولی کا شکار ہو گیا تھا۔

یہ کیا پوچھا آپ نے؟ وہ گولی کس نے چلائی تھی؟

اس کا جواب ممکن ہے آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ لیکن غور کرنے پر ہر بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

وہ ایک ہی گولی تھی جس نے شکیل کو زندگی کی حدود سے اُٹھا کر موت کی وادی میں پھینک دیا۔ لیکن یقین مانئے کہ اس ایک گولی کے چلانے والے کئی تھے۔

وہ گولی شہری امن وامان کے ذمہ داروں نے چلائی تھی۔ وہ گولی اس معاشرے نے چلائی تھی جو اپنے دامن میں ہر قسم کے غلط اور غیر صحت مند رجحانات کی پرورش کر رہا ہے۔ وہ گولی اس قوم نے چلائی تھی جو سزا دینا جانتی ہے لیکن انصاف کرنا نہیں جانتی۔

شکیل شہری امن وامان کے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہ ایک غیر صحت مند معاشرے کا فرد ضرور تھا لیکن وہ اس معاشرے کے غیر صحت مند رجحانات سے محفوظ فی الواقع ایک معصوم نوجوان تھا ـــــ ماں باپ کا فرمانبردار اور گھر بھر کا ناز بردار۔ عزیزوں کا عزیز اور دوستوں کا محبوب۔ اپنی محنت سے پاس کرنے والا اور اپنی ریاضت سے آگے بڑھنے والا طالب علم۔

تو سوال یہ ہے کہ وہ گولی کا شکار کیوں ہو گیا؟

یہی بات تو پورے ملک و قوم کے لیے غور طلب ہے۔ اگر آپ نے اس پر غور کرنے سے پہلے اس سانحے کو فراموش کر دیا ہے تو میں کہوں گا کہ آپ نے اس سانحے کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ دراصل یہ سانحے کے ساتھ ایک سانحہ ہے۔

سوچنے کی بات تو یہی ہے کہ اس دنیا میں مجرموں کی سزا معصوموں کو کیوں دی جاتی ہے۔ پھر یہ کہ سزائے عظیم دیتے وقت بھی احتیاط کیوں نہیں برتی جاتی؟ کسی سے اس کی زندگی چھینتے وقت یہ کیوں نہیں سوچا جاتا کہ مرنے والا تو آن کی آن میں گولی کا شکار ہو کر تمام احساسات سے عاری ہو جائے گا لیکن اس کے زندہ رہنے والے عزیزوں پر کیا گزرے گی اور کیا کچھ گزرتی رہے گی۔

کاش رائفل کی وہ بے رحم گولی سمجھ سکتی کہ مرنے والا صرف اپنے جسم کو نہیں بلکہ اپنے پس ماندگان کی روحوں کو بھی اپنی قبر میں لے جاتا ہے۔

• موت زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ اگر سزا کے لیے بھی یہ حادثہ ضروری ہو تو کم از کم اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہ حادثہ اس شخص کے ساتھ پیش آئے جو سزا کا فی الواقع مستحق ہے۔ معصوموں کو سزا دے کر مجرموں کی اصلاح ممکن نہیں۔

مئی ۱۹۶۹ء

سوز حیدرآبادی

لے گئے خاک میں وہ داغ تمنائے نشاط

مشرقی پاکستان کے اُبھرتے ہوئے جواں سال ڈراما نگار اور غزل گو شاعر سوز حیدرآبادی ۲۳ رجون ۱۹۶۹ء کو شام کے سات بجے اپنے خاندان و وابستگان کو داغِ مفارقت دے گئے ۔

جو لوگ سوز کو نہیں جانتے ان کے لیے سوز کی موت دُنیا کے ہر روزہ بے شمار حادثاتِ اموات میں سے ایک حادثہ ہے اور بس ۔ لیکن ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کی موت ہمارے معاشرے کا ایک غیر معمولی المیہ بھی ہے ۔

جس عمر میں جن حالات کے نتیجے کے طور پر جس پس منظر کے ساتھ سوز نے فرشتۂ اجل کو لبیک کہا ان سب عوامل نے سوز کی موت کو ایک زبردست معاشرتی المیہ بنا دیا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ زندگی سوز سے نہیں روٹھی ۔ خود سوز زندگی سے روٹھ کر زندوں کی محفل سے اُٹھ گئے ۔

صرف ان کی موت ہی نہیں ان کی زندگی بھی ایک المیہ تھی ۔ وہ جس کرب کے ساتھ جیئے اُسی کرب کے ساتھ مرے ۔ اگر وہ اپنی زندگی کے ساتھ اچھا سلوک نہ کر سکے تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ خود زندگی نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا ۔

قدرت نے ان کو ایک صحیح و سالم جسم اور زندگی نے ان کو زندگی کی بہت سی ضروری سہولتوں سے محروم رکھا تھا ۔ لیکن وہ اپنی ان محرومیوں کے باوجود جی رہے

تھے۔ البتہ جب ایک محبوب ہستی نے انھیں اپنی محبت دے کر اپنی محبت واپس لے لینے کی کوشش کی تو وہ اس محرومی کی تاب نہ لا سکے اور خواب آور گولیاں کھا کر ہمیشہ کے لیے محوِ خواب ہو گئے۔

سوز نے جب یہ محسوس کیا کہ انھیں اُن کی زندگی کی ضرورت نہیں رہی تو وہ یہ محسوس نہ کر سکے کہ ان کی زندگی کم از کم دوسروں یعنی ان کے خاندان والوں کے لیے ضروری تھی۔ دراصل جب انسان اپنے لیے جی نہیں پاتا تو دوسروں (خواہ وہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہن ہی کیوں نہ ہوں) کے لیے بھی جینا ناممکن ہو جاتا ہے۔

کوئی نہیں جانتا کہ لوگ جن لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں ان میں سے کون کب اور کس طرح ساتھ چھوڑ دے گا۔ کل تک وہی سوز جو ہر ادبی محفل میں موجود رہا کرتے تھے آج محفلِ حیات ہی سے غائب ہیں۔

سوز ایک غریب مگر خوددار خاندان کے حددرجہ خوددار، حساس، خاموش طبع، متین، شریف اور وضع دار فرد تھے۔ ہنسنے ہنسانے کی صلاحیت سے محروم نہ تھے لیکن ہمیشہ سنجیدہ نظر آتے تھے۔ سنجیدہ ہی نہیں بظاہر پُرسکون بھی — جیسے کہ اُنھوں نے حوصلہ و ہوس کی تمام رزم آرائیوں پر قابو پا لیا ہو۔ لیکن کسے خبر تھی کہ ان کی شخصیت کے پُرسکون ساحل کی تہہ میں وہ طوفان پرورش پا رہا تھا جو آخرکار ایک دن انھیں لے ڈوبے گا ؎

جو خاموش رہتے ہیں ان کے بھی دل میں

تلاطم نہیں ہے کہ طوفان نہیں ہے

سوز ایک خود ساختہ انسان تھے۔ اُنھوں نے انتہائی ناسازگار حالات کے باوجود ہر طرح کی محنت مزدوری کر کے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ایف اے میں داخلہ بھی لیا لیکن خاندانی ذمہ داریوں کی بنا پر اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ ایک انشورنس کمپنی میں ملازم تھے اور انشورنس کے رموز و نکات کو سمجھنے اور انتظامی معاملات کو سرانجام دینے میں امتیازی مہارت رکھتے تھے۔ ادھر دو سال سے

ان کی ادبی صلاحیتیں بھی نکھرتی چلی جارہی تھیں ۔ افسوس کہ موت (یا زندگی؟)
کے ظالم ہاتھوں نے ایک ہونہار اہل قلم کو ہم سے چھین لیا ۔

جو لوگ موت کو ظالم قرار دیتے ہیں
خدا ملائے انھیں زندگی کے ماروں سے

---

۳۰ جون ۱۹۶۹ء

شورش کاشمیری

غالباً ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ میں ڈھاکے میں تھا اور نیاز فتح پوری اور ان کا رسالہ 'نگار' لکھنؤ میں۔ اسی زمانے میں رشید احمد صدیقی کے عنوان سے میرا ایک مضمون رسالہ 'نگار' میں شائع ہوا۔ کچھ مدت کے بعد مجھے کسی نے اطلاع دی کہ میرا وہ مضمون رسالہ 'چٹان' لاہور میں قسط وار نقل کیا گیا۔ اس وقت تک میں نے شورش کاشمیری کا نام اور ان کے کچھ اوصاف ضرور سن رکھے تھے لیکن رسالہ 'چٹان' کی شکل و صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے انھیں خط لکھا کہ براہ کرم 'چٹان' کے وہ پرچے میرے نام بھیج دیں جن میں میرا مضمون قسط وار نقل کیا گیا ہے۔ ان پرچوں کی نایابی کے باعث شورش صاحب وہ پرچے تو نہ بھیج سکے لیکن میرے نام 'چٹان' بھیجنے لگے جس کا سلسلہ کسی قدر عدم تسلسل کے باوجود آج تک جاری ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی ان کی بھی کمزوری تھے اور میری بھی کمزوری ہیں۔ ہم دونوں کی یہی مشترک کمزوری ہمارے درمیان روابط اور مراسم کا سبب بنی۔ میرے نام شورش صاحب کے تمام خطوط محفوظ ہیں لیکن چونکہ اس وقت ان کو خطوط کے انبار میں سے نکالنا ممکن نہیں اس لیے بتانہ ہیں سکتا کہ انھوں نے رشید احمد صدیقی سے متعلق میرے مضمون پر مجھے کن الفاظ میں داد دی تھی۔

چند سال بعد میں نے شورش صاحب کو خط لکھا کہ اگر ممکن ہو تو میرے

تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ اپنے ادارے کے زیرِ اہتمام شائع کر دیں۔ جواب ملا کہ اگرچہ ان کے ادارے کی طرف سے دُوسرے مصنفین کی کتابیں شائع نہیں ہوتیں لیکن وہ میری کتاب شائع کر کے خوشی محسوس کریں گے۔ چنانچہ میں نے مسودہ ان کے پاس بھیج دیا۔

اُنھوں نے وعدہ کیا کہ کتاب جلد سے جلد شائع کر دیں گے، لیکن جب زیادہ سے زیادہ تاخیر ہوتی چلی گئی تو میری یاد دہانی اور تقاضے بڑھتے چلے گئے۔ جواب میں وہ کبھی اپنی طبیعت کی ناسازی، کبھی بیگم شورش کی علالت اور کبھی کچھ دُوسرے عذر پیش کرتے رہے جو یقیناً صحیح اور سچے ہوں گے۔ لیکن ان کے مسلسل عذر میرے مسئلے کا حل نہ تھے۔ آخر کار میں نے اُنھیں یہ لکھنا شروع کیا کہ اگر میری کتاب کی طباعت میں آپ کی دشواریاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں تو براہ کرم مسودہ واپس کر دیں۔ لیکن شورش صاحب نہ میرا مسودہ واپس کرنے پر آمادہ تھے نہ کتاب جلد یا مزید تاخیر کے بغیر شائع کرنے پر اختیار رکھتے تھے۔

اُنھی دنوں میں نے شورش صاحب کو اپنے ایک وکیل کرم فرما کے مشورے پر لکھ دیا کہ اب اگر مسودہ واپس نہ آیا تو میں اپنے آپ کو قانونی چارہ جوئی پر مجبور پاؤں گا۔

شورش صاحب نے میرا مسودہ فوراً واپس کر دیا اور خط میں لکھا کہ قانونی چارہ جوئی کی دھمکی نہ دیں۔ قانونی کارروائی میرے لیے ایک ضمنی بات ہے۔

شورش صاحب سے تعلقات ختم ہو گئے لیکن میرے نام 'چٹان' باقاعدگی سے آتا رہا۔ کئی سال بعد صدر ایوب کے عہدِ حکومت میں جب قومی اسمبلی کا اجلاس ڈھاکے میں ہو رہا تھا ایک دن ڈاکٹر عندلیب شادانی نے مجھے بتایا کہ دو تین دن ہوئے شورش کاشمیری تمھیں ڈھونڈ رہے تھے۔ میں نے ان کو تمھارے کالج کا پتا بتا دیا تھا۔ شاید اب بھی وہ ڈھاکے میں ہوں۔ ڈاکٹر باقر کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔

پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر باقر کو ان کے شاگرد خورشید احمد نے جو ایوب کابینہ میں وزیرِ قانون تھے کسی بل کے سلسلے میں اپنی علمی مدد کے لیے لاہور سے بلوا لیا تھا۔ ڈاکٹر شادانی کی بدولت میں ڈاکٹر باقر سے متعارف تھا۔ وہ ایم۔ این۔ ایز ہوسٹل میں قیام پذیر تھے۔ میں ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے بتایا کہ شورش صاحب نے آپ کو بہت ڈھونڈھا لیکن انھیں جو جو پتا بتایا گیا اس پر آپ نہ مل سکے۔ وہ آپ کی تحریروں کے بڑے مداح ہیں۔ آج ہی صبح لاہور واپس چلے گئے۔

مجھے شورش صاحب کی اس تلاش نے بے حد متاثر کیا۔ میں نے فوراً انھیں ایک خط لکھا جس میں ان کی بلند ظرفی اور وسیع القلبی کو سراہتے ہوئے اپنی کتاب کی طباعت سے متعلق بدمزگی پر اپنی شرمندگی کا اظہار کیا۔ انھوں نے ملاقات کے نہ ہونے پر انتہائی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ مجھے تو وہ بدمزگی یاد بھی نہیں۔ شورش صاحب جیسی ممتاز شخصیت کا مجھ بے مایہ کو ڈھونڈھنا بذاتِ خود میرے لیے ایک اعزاز تھا لیکن انھوں نے صرف اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنے خط میں میرے اندازِ تحریر کو پھر ایک مرتبہ کلماتِ تحسین سے نوازا۔

دسمبر ۱۹۶۹ء میں جب میں مشرقی پاکستان کو خیرباد کہہ کر کراچی آ گیا تو میں نے شورش صاحب کو تبدیلیٔ مقام سے مطلع کر دیا۔ مجھے بڑی آرزو تھی کہ شورش صاحب جیسے صاحبِ طرز ادیب اور اپنے عہد کے ایک ممتاز ترین خطیب سے ملوں انھیں دیکھوں اور سنوں۔ یہ آرزو ۱۹۷۰ء میں کراچی میں پوری ہوئی۔ میں کراچی میں ڈیڑھ سال رہا۔ اس دوران میں مجھے ان سے دو مرتبہ ہوٹل جبیس میں ملنے اور ایک مرتبہ ان کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ وہ جب بھی کراچی آتے ہوٹل جبیس ہی میں ٹھہرتے۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملتے، دیر تک باتیں ہوتیں۔ ایک مرتبہ گفتگو کے دوران انھیں ہوٹل کے بلوں پر دستخط کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ لیٹے لیٹے انھوں نے اپنا قلم تکیے کے نیچے اور اِدھر اُدھر ڈھونڈھا۔ قلم کے نہ ملنے پر حیرانی کا اظہار کرنے لگے تو میں نے

کہا۔ شورش صاحب! معلوم ہوتا ہے کسی کو زورِ قلم کی ضرورت تھی۔ اس لیے وہ آپ کا قلم لے گیا۔ اس پر اُنھوں نے برجستہ یہ شعر پڑھ دیا ؎

نامرد کے ہاتھ میں پہنچ کر
شمشیر نیام ہو گئی ہے

میرے ساتھ ساتھ تمام حاضرین اس حاضر جوابی سے بہت متاثر اور محظوظ ہوئے۔

اکتوبر ۱۹۷۴ء میں میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کی دعوت پر لاہور گیا۔ میرے کرم فرما محمد احسن خاں صاحب جو علم و ادب کے خاموش پرستاروں اور خدمت گزاروں میں سے ہیں انھوں نے مجھے بتایا کہ شورش صاحب سخت بیمار ہیں آپ اُن سے مل لیں۔ انسان کی زندگی کا کوئی ٹھیک نہیں۔ میں وقت کی کمی کے باعث شورش صاحب سے ملاقات کو لاہور کے آئندہ دورے پر اُٹھا رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن احسن صاحب کی اطلاع کی بنا پر میں نے شورش صاحب سے ملاقات کو ضروری جانا۔ ان کے ہاں جانے سے پہلے فون کرنا بھی ضروری معلوم ہوا تاکہ عیادت ان کے لیے غیر معمولی زحمت کا باعث نہ بن جائے۔ جواب میں شورش صاحب کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ کتنے بیمار تھے اور کتنے نحیف و نزار ہیں۔ فون کرنے کے بعد میں احسن صاحب کے ہمراہ لاہور میں پہلی مرتبہ شورش صاحب سے ان کے گھر پر ملا۔ وہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور صحیحاً مریض معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے سرہانے ایک چھوٹی سی میز پر دواؤں کی شیشیوں کا انبار تھا۔ اپنی بیماری کا حال بیان کرتے ہوئے بتانے لگے کہ حکیم محمد سعید دہلوی نے یہ دوائیں بھیجی ہیں اور فلاں حکیم صاحب نے وہ دوائیں اور فلاں ڈاکٹر صاحب نے وہ دوائیں۔ پھر باتیں کرتے کرتے اٹھ بیٹھے۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ لیٹے لیٹے بات کریں لیکن کہنے لگے میں لیٹے لیٹے تھک گیا ہوں ۔۔۔ بیٹھ کر باتیں کرنے میں آرام محسوس کر رہا ہوں۔

ایک ہم ذوق کا مل جانا بھی تو علاج سے کم نہیں۔ ان کے پاس ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ شورش صاحب نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے یہ صاحب بزہد بخ صاحب جن کی کتاب "تاثرات و تعصبات" کو میں کا ہے گا ہے پڑھتا رہتا ہوں ابھی چند روز پہلے اپنی بیٹی سے میں ان کی کتاب کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ رشید احمد صدیقی کے بعد آج کے لکھنے والوں میں مجھے نظیر صاحب کی تحریر سب سے زیادہ دل کش معلوم ہوتی ہے اور یہ ہیں جناب خواجہ عبدالرحیم مجلس اقبال لاہور کے صدر۔ اب کے یوم اقبال میں آپ لاہور ضرور آئیں۔ میں آپ کو اپنی طرف سے بھی مدعو کرتا ہوں اور خواجہ صاحب کی طرف سے بھی۔ اس پر خواجہ صاحب نے بھی کہا کہ میں بھی آپ کو مدعو کرتا ہوں۔ میں نے کہا۔ یہ میری دیرینہ آرزو رہی ہے کہ لاہور میں مجلس اقبال کے زیر اہتمام یوم اقبال دیکھوں۔ لیکن یہ آرزو اب تک پوری نہ ہو سکی۔ شورش صاحب سے اس ملاقات کے بعد دوسرے دن میں اسلام آباد واپس آ گیا اور غالباً تیسرے دن میں نے اخبار میں خبر پڑھی کہ خواجہ عبدالرحیم حرکتِ قلب رُک جانے کے باعث انتقال کر گئے۔

خیر بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ شورش صاحب سے اس ملاقات میں بعض نئے نثر نگاروں کا ذکر آیا جو مخصوص اور منفرد اسلوب رکھتے تھے۔ وہ نئے نثر نگاروں سے بے خبر نہ تھے۔ وہ ان کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے رہے۔ جب مختار مسعود اور ان کی کتاب "آوازِ دوست" کا ذکر آیا تو میں نے آوازِ دوست سے متعلق اپنے مضمون کے بارے میں پوچھا کہ ان کی نظر سے گزرا یا نہیں۔ جب انھوں نے کہا کہ وہ مضمون ان کی نظر سے نہیں گزرا تو میں نے اس کا تراشہ بھیج دینے کا وعدہ کر لیا اور جب میں نے اس کا تراشہ ان کے پاس بھیجا تو انھوں نے خط میں لکھا :۔

"آپ کا مضمون 'آوازِ دوست' سے متعلق دیکھا۔ خوب ہے بلکہ خوب تر۔ ظاہر ہے کہ آپ میری تحسین سے بالا ہیں۔ کوئی خدمت ؟ لاہور روان

نہیں ہو رہا۔ خط ژولیدہ ہو گیا ہے۔"

میرے نام یہ اُن کا آخری خط تھا۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں میرے لاہور جانے کا امکان تھا۔ اُمید تھی کہ اب کے شورش صاحب سے ایک تفصیلی ملاقات رہے گی۔ لیکن میں نومبر ۱۹۷۵ء کے آخر تک لاہور نہ جا سکا۔ اس دوران میں شورش صاحب اچانک وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا کرتا۔ میرے نزدیک ان کی وفات محض ایک دلیر، بے باک اور ممتاز صحافی کی وفات نہیں بلکہ ایک ایسی شخصیت کی وفات ہے جو کئی شخصیتوں کا مجموعہ تھی ؎

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ان کے گوناں گوں کمالات پر اظہار خیال کسی اور موقع کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں۔

مئی ۱۹۷۶ء

پروفیسر سیّد وقار عظیم

وقار عظیم صاحب کا نام پہلے پہل میں نے اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں سنا اور دیکھا۔ وہ اس زمانے میں رسالہ 'آج کل' دہلی کے ایڈیٹر تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرا طالب علمانہ ذہن انسان کی تمام قسموں میں ادیبوں، پروفیسروں اور ایڈیٹروں کو سب سے زیادہ قابل اور قابلِ احترام سمجھنے لگا تھا۔ یہ تصور مجھے نہ تو ورثے میں ملا تھا نہ میرے ماحول نے مجھے دیا تھا۔ نہ جانے یہ تصور میرے ذہن میں کہاں سے آ گیا تھا۔ بہر حال میں ان تمام لوگوں کو جو ادیب یا پروفیسر یا ایڈیٹر ہوتے تھے انتہائی رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور حد درجہ خوش نصیب سمجھتا تھا۔ ان تینوں طبقوں کے متعلق میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ یہ لوگ علم و فضل کا مجسمہ ہوتے ہیں اور دُنیا میں علم و فضل سے بڑھ کر کوئی اور شے قابلِ احترام نہیں ہے۔

ابھی میں اسکول ہی کا طالب علم تھا کہ رسالہ آج کل دہلی میں سید وقار عظیم کی جگہ یعقوب دواشتی کا نام آ گیا اور وقار عظیم صاحب کسی کسی رسالے میں محض ایک مضمون نگار کی حیثیت سے نظر آنے لگے۔ یہ باتیں ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۶ء کے درمیان کی ہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن گیا۔ جون ۱۹۴۸ء میں جب میں گورکھپور میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان دے کر ڈھاکے آیا تو اُس زمانے میں میں نے وقار عظیم صاحب کا نام پھر ایک مرتبہ ایڈیٹر کی حیثیت سے ماہِ نو کراچی میں دیکھا۔ کچھ عرصے کے بعد 'ماہ نو' میں وقار عظیم کی

جگہ حسن عسکری کا نام آگیا اور جب حسن عسکری صاحب نے اپنی ادارت میں شائع ہونے والے پہلے پرچے میں وقار عظیم صاحب کی مدیرانہ خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا تو چونکہ میں اس وقت تک حسن عسکری صاحب کا بڑا پرستار بن چکا تھا اس لیے ان کے خراجِ تحسین کی بنا پر میرے دل میں وقار عظیم صاحب کی وقعت اور بڑھ گئی۔ وقار عظیم صاحب "ماہ نو" کی ادارت سے سبک دوش ہوکر اور کراچی سے نکل کر پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جا پہنچے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے "نقوش" کی ادارت بھی سنبھال لی تھی۔ اب ان کی ذات میں وہ تینوں حیثیتیں جمع ہو گئی تھیں جنھیں میں حد درجہ رشک اور احترام سے دیکھتا تھا یعنی وقار عظیم صاحب ادیب تو تھے ہی، اب نہ صرف پروفیسر (اردو میں لکچرر کو بھی تعظیماً پروفیسر ہی کہتے ہیں) بن چکے تھے، بلکہ ادیب اور پروفیسر ہونے کے علاوہ ایڈیٹر بھی۔ اس زمانے میں شاید ہی کوئی اچھا رسالہ ایسا ہو جس میں وقار عظیم صاحب کا کوئی نہ کوئی مضمون نہ ہوتا۔ میں ہر لبیار نویس ادیب اور بزرگ شاعر کو حیرت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ جب میری سمجھ میں کچھ اضافہ ہوا تو میں ایسوں کو افسوس کی نظر سے دیکھنے لگا۔

جنوری ۱۹۵۰ء میں جب میں بی۔ اے کا طالب علم تھا مجھ سے ایک عجیب حرکت سرزد ہوئی۔ اس زمانے کے معیاری اور ممتاز رسالوں میں ادبِ لطیف (لاہور) بھی تھا جس کی امتیازی حیثیت نسبتاً زیادہ پرانی تھی۔ اس زمانے میں اس کے ایڈیٹر میرزا ادیب تھے۔ "ادبِ لطیف" کے ایک پرچے میں ایک نئے شاعر کی ایک غزل دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایسی بے جان غزل "ادبِ لطیف" میں کیونکر جگہ پا گئی۔ اس حیرت اور کوفت کے دوسرے دن صبح کے وقت میری آنکھ کھلی تو اس مایوس کن غزل کی زمین میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ایک مطلع میرے ذہن میں آگیا ۔۔۔

ہمدم ابھی نہ چھیڑ مہ و کہکشاں کی بات
فرصت زمیں سے ہو تو کریں آسماں کی بات

اس مطلع نے مجھ سے کچھ اور شعر کہلوا لئے ۔ اس طرح میری پہلی غزل وجود میں آئی ۔ جب میں نے اپنی غزل کا 'ادب لطیف' والی غزل سے مقابلہ کیا تو دل نے کہا کہ اگر 'ادب لطیف' والی غزل 'ادب لطیف' میں شائع ہو سکتی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں میری غزل شائع نہ ہو سکے ۔ میری غزل یقیناً بدرجہا بہتر ہے اور اگر یہ غزل چھپ گئی تو 'ادب لطیف' میں چھپنے والے غزل گو کو معلوم ہو جائے گا کہ ع دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

چنانچہ میں نے اپنی غزل میرزا ادیب صاحب کی خدمت میں بھیج دی۔ ان کا خط آیا کہ غزل کا شکریہ ۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ہم اسے شائع کرنے سے معذور ہیں ۔ دل نے اس معذرت پر یہ تبصرہ کیا کہ ع سخن شناس نہٗ دلبرا خطا ایں جاست۔ اس زمانے میں ادوم پرکاش پنڈت کی ادارت میں دلی سے ایک معیاری رسالہ[1] نکلتا تھا جو ترقی پسندوں کا ترجمان تھا ۔ اس وقت رسالے کا نام یاد نہیں آرہا ہے ۔ میں نے اپنی غزل اس رسالے کو بھیج دی ۔ وہاں سے بھی ٹکا سا جواب آگیا کہ اس غزل کا شکریہ ۔ لیکن آپ کوئی دوسری غزل بھیج دیں ۔ میں نے انھیں اپنی دوسری غزل (جو ابھی تک کہی نہیں گئی تھی) بھیجنے کی بجائے اسی غزل کو اس زمانے کے بہترین رسالوں میں سے ایک بہترین رسالہ 'نقوش' لاہور کے ایڈیٹر سید وقار عظیم کو بھیج دی ۔ ایک مدت تک ان کی طرف سے نہ کوئی رسید آئی نہ کوئی جواب ۔ اس دوران میں ایک دوست کے ساتھ مجھے کلکتے اور بمبئی کا سفر کرنا پڑا ۔ بمبئی میں ایک دن وہاں کے ایک بک اسٹال پر کتابوں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ 'نقوش' کا تازہ شمارہ نظر آگیا ۔ ناامیدی کے ساتھ اس کی ورق گردانی شروع کی تو دیکھا کہ اس میں میری غزل موجود ہے ۔ اپنی غزل کو وقت کے ایک نہایت ممتاز رسالے میں دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی لیکن یہ معمہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہی غزل باقی دو رسالوں کی طرف سے سترد

---

[1] ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود نام یاد نہیں آرہا ہے ۔ ن ۔ ص

کیوں کر دی گئی جب کہ ان دو رسالوں کا معیار کسی اعتبار سے 'نقوش' سے برتر نہ تھا اور خصوصاً جب کہ میری غزل اُس غزل سے یقیناً بہتر تھی جس کے جواب میں وہ کہی گئی تھی۔

بہرحال 'نقوش' میں غزل کی اشاعت کے باوجود نہ تو نقوش سے میرے تعلقات پیدا ہوئے نہ وقار عظیم صاحب سے۔ برسوں بعد جب پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا اور غالباً اس کا پہلا سالانہ اجلاس ڈھاکے میں ہوا تو پاکستانی ادیبوں کی سب سے بڑی انجمن پاکستانی رائٹرز گلڈ کے اس اجلاس کی صدارت کے فرائض وقار عظیم صاحب نے انجام دیئے۔ اس اجلاس میں قرۃ العین حیدر سمیت پاکستان کے بیشتر ممتاز ترین ارباب قلم موجود تھے۔ اردو، بنگلہ اور انگریزی میں پڑھے جانے والے مقالات کے بعد جب وقار عظیم صاحب صدارتی تقریر کے لیے مائک پر آئے تو اُنھوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اردو میں تقریر کی۔ اس تقریر کے متعلق مارننگ نیوز ڈھاکا کے ایک ممتاز صحافی خطیب صاحب جو انگریزی کے شاعر اور ادیب بھی ہیں (نہ جانے ابھی تک وہ ڈھاکے میں ہیں یا اپنے وطن سیلون چلے گئے) اور جو نہایت نازک مزاج نقاد واقع ہوئے ہیں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج کے اجلاس کا حاصل صرف وقار عظیم صاحب کی تقریر ہے ورنہ باقی تمام چیزیں بکواس تھیں۔ ممکن ہے یہ رائے مبالغے سے خالی نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ وقار عظیم صاحب کی تقریر اپنے اندر کوئی فلسفیانہ گہرائی نہ رکھنے کے باوجود اپنے خلوص اور وقت کی مناسبت کے اعتبار سے مؤثر تھی۔ اس اجلاس کے بعد رائٹرز گلڈ کی طرف سے کتابوں کی نمائش بھی منعقد ہوئی تھی۔ ان تقریبات میں وقار عظیم صاحب سے میری صاحب سلامت ضرور ہوئی لیکن تعارف کے بغیر۔

صحیح معنوں میں اُن سے میری ملاقات غالباً ۱۹۶۸ء میں ہوئی جب وہ غالباً زبانی امتحان (viva voce) کے سلسلے میں ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو

کی دعوت پر ڈھاکے آئے اور اپنے چھوٹے بھائی پروفیسر اقبال عظیم کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ جب اقبال عظیم صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا تو انھوں نے میرا نام سنتے ہی بڑی مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ آپ کی تحریروں سے میری دلچسپی کا حال یہ ہے کہ اگر سفر کے عالم میں بھی مجھے کوئی ایسا رسالہ مل جائے جس میں آپ کا مضمون موجود ہو تو میں باقی لوگوں کو چھوڑ کر سب سے پہلے آپ کا مضمون پڑھ لیتا ہوں۔ ماشاءاللہ آپ کی تحریروں میں . . . . اب مجھے یاد نہیں کہ اُنھوں نے میری تحریروں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کیا کچھ کہا لیکن اُنھوں نے جس فیاضی اور دیانت داری کے ساتھ کہا اس نے مجھے برصغیر کے تین اور بزرگ اہلِ قلم کی فیاضی اور دیانت داری یاد دلادی جو وقار عظیم صاحب ہی طرح میرے ایسے ایک جونیئر ادیب اور اجنبی شخص کے بارے میں ایسی رائیں ظاہر کر گئے ہیں جن کی تمنا تو کی جا سکتی ہے لیکن جن کی توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی۔

ڈھاکے کی اس ملاقات کے بعد جس میں ان سے میرا تعارف صحیح طور پر ہو سکا اُن سے تین چار سرسری ملاقاتیں کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں ہوئیں۔ جب میں پہلی مرتبہ لاہور گیا تو وقت کی کمی کے باعث ان سے صرف فون پر گفتگو ہو سکی۔ انھوں نے بے حد اصرار کیا کہ میں ان کے گھر آکر ملوں۔ میری یہ تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی کہ کبھی لاہور جاؤں تو ان کے گھر جا کر ان سے جی بھر کر مل سکوں۔ جب تک وہ زندہ رہے میں صرف اس بات کے امکان سے اپنے آپ کو مطمئن کرتا رہا کہ ایک دن یہ تمنا پوری ہو ہی جائے گی۔ لیکن پچھلے سال (۱۹۷۶ء) اسی نومبر میں جب اچانک ان کے انتقال کی خبر نظر سے گزری تو امید اور امکان کی یہ عمارت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آن کی آن میں ڈھ گئی۔

وقار عظیم صاحب سے میری دیرینہ اور طویل ملاقاتیں نہیں تھیں کہ میں ان کا شخصی خاکہ لکھ سکوں۔ ان کی خوبیاں اور خامیاں ان کے قریبی جاننے والے جانتے ہوں گے۔ میں نے تو صرف یہ دیکھا اور پایا کہ آدمی بہت خوش مزاج، خوش اخلاق اور نرم گفتار

… ان کی شخصیت میں توازن بھی تھا، وقار بھی اور وزن بھی۔ لاہور کے تعلیمی، علمی ادبی اور ثقافتی حلقوں میں وہ بڑے سے بڑے منصب پر فائز رہے اور اس منصب تک پہنچنے کے لیے اُنھیں سیاست اور سازش کی راہ کبھی اختیار نہیں کرنی پڑی۔ زندگی میں وہ جس قدر محترم رہے اس سے کہیں زیادہ ان کی موت نے ان کے ہر دلعزیز ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ جب اُنھیں بچانے کے لیے ٹیلی وژن پر خون کا عطیہ دینے کا اعلان کیا گیا تو اسپتال میں خون دینے والوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے جن میں بڑے اونچے رُتبے کے لوگ بھی موجود تھے۔

مجھے ادب میں ان کی بعض رایوں اور ان کے ایک ذاتی عمل سے اختلاف ضرور ہے۔ وہ غیر سیاسی آدمی تھے اس لیے اُنھیں حکومت وقت کے ایما پر یا اس کی خوشنودی کے لیے کسی سیاسی جماعت کے خلاف ٹی وی پر لب کشائی سے احتراز کرنا چاہیے تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُنھوں نے یہ کام کن حالات میں کن مجبوریوں کے تحت کیا بہرحال مجموعی طور پر ان کے شریف النفس اور شائستہ انسان ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ادب میں ان سے کسی کو ہزار اختلافات ہوں ان سے ان کا یہ اعزاز نہیں چھینا جا سکتا کہ وہ داستان، ناول اور مختصر افسانے کے پہلے خصوصی نقاد تھے۔ اُنھوں نے ان اصنافِ ادب کے مطالعے کے لیے اپنی زندگی کا جتنا حصہ صرف کیا اتنا کوئی اور نہ کر سکا۔

یکم نومبر ۱۹۷۷ء

کرشن چندر سے دو ملاقاتیں

کرشن چندر کے افسانوں سے میرا تعارف میرے لڑکپن کے دوست غیاث احمد گدّی نے کرایا تھا جن کے افسانے پاکستان اور ہندوستان میں بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگِ عظیم اور اردو ادب کی ترقی پسند تحریک دونوں عنفوانِ شباب کے عالم میں تھیں۔ میں اسکول کا طالب علم تھا اور غیاث احمد گدّی کو یہ سعادت بھی نصیب نہ تھی۔ لیکن وہ اپنی فطری علم دوستی اور ادب پرستی کی بنا پر اس زمانے کے اردو ادب بالخصوص اردو کے افسانوی ادب سے خاصی واقفیت رکھتے تھے۔ وہی زمانہ کرشن چندر کی ادبی معراج کا زمانہ بھی تھا۔ قحط بنگال پر ان کا افسانہ 'ان داتا' پڑھنے کے بعد ہم دونوں ان کے سحر سے پورے طور پر مسحور ہو چکے تھے۔ وہ ہم دونوں کے سب سے بڑے ادبی ہیرو تھے۔ ہم دونوں ان کے بڑے عاشق تھے لیکن آپس میں ایک دوسرے کے رقیب نہ تھے۔

کرشن چندر کے معاملے میں جہاں غیاث احمد گدّی کو یہ شرف حاصل ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ایک انٹرویو میں پاکستان اور ہندوستان کے پانچ چھ ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں کے نام بتاتے ہوئے کرشن چندر نے غیاث احمد گدّی کا ذکر بھی کیا تھا وہاں مجھے بھی یہ فخر حاصل ہے کہ ۱۹۵۰ء میں مجھے بمبئی میں ان

سے دومرتبہ ملنے کی مسرت میسر آئی۔

لوگ مجھے زیادہ تر تنقید نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں اس لیے یہاں یہ ذکر بھی بیجا نہ ہوگا کہ میری سب سے پہلی تنقیدی کوشش کا موضوع بھی کرشن چندر تھے۔ یہ مضمون میں نے انٹرمیڈیٹ کی طالب علمی کے زمانے میں لکھا تھا۔ ایک ادبی بزرگ نے میری حوصلہ افزائی کے لیے اسے اس زمانے کے ایک مشہور رسالہ 'عالمگیر' لاہور کے سالانہ نمبر میں شائع ہونے کے لیے بھیج دیا تھا۔ مجھے اس مضمون کے چھپنے کی اطلاع غیاث احمد گدی ہی نے دی تھی۔ عجب اتفاق ہے کہ آج تک وہ چھپا ہوا مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔

۱۹۵۰ء میں جب میں بی اے کے امتحان سے فارغ ہوا تو میرے ایک دوست جن کا کاروبار کلکتے اور بمبئی میں تھا ڈھاکے سے دو تین ہفتے کے لیے کلکتے اور بمبئی گئے۔ ان کے شدید اصرار پر مجھے بھی ان کے ساتھ کلکتے اور بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ بمبئی جانے میں میری سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ وہاں کرشن چندر سمیت اردو کے بہت سے ادیبوں کو دیکھنے کا موقع مل سکے گا سو یہ موقع ملا۔

بمبئی جیسے بڑے شہر میں مکمل پتے کے بغیر کسی تک پہنچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ بہرحال سب سے پہلے جو پتا ملا وہ عصمت چغتائی کا تھا۔ اُمید پیدا ہوئی کہ ان کے پتے سے کرشن چندر کا گھر بھی مل جائے گا یا یہ بھی ممکن ہے کہ کرشن چندر خود عصمت چغتائی کے گھر پر مل جائیں۔ چنانچہ میں سب سے پہلے عصمت کے ہاں پہنچا۔ وہاں عصمت سے بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ بتایا گیا کہ اگر میں اتوار کو شام کے ۴ بجے دیودار ہال پہنچ سکوں تو وہاں کرشن چندر، عصمت اور کئی دوسرے ادیبوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ دیودار ہال میں ترقی پسند ادیبوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ دیودار ہال میں ترقی پسند ادیبوں کا ہفتہ وار جلسہ ہوا کرتا تھا۔ اتوار کو دیودار ہال پہنچا۔ ہال کے سامنے قمیص اور

پینٹ میں ملبوس ایک جواں سال وجیہ صورت شخص کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا ـــ دیودار ہال یہی ہے ؟

وہ جی ہاں

مَیں ترقی پسند مصنفین کا جلسہ یہیں ہوتا ہے ؟

وہ جی ہاں ۔ تشریف رکھیے ۔

مَیں آپ کا اسمِ گرامی معلوم کر سکتا ہوں ۔

وہ مجھے کیفیؔ اعظمی کہتے ہیں ۔

مَیں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ۔ میں آپ سے اور آپ کے دوسرے ساتھیوں سے نیاز حاصل کرنے ہی کے لیے حاضر ہوا ہوں ۔ میرا نام نظیر صدیقی ہے میں ڈھاکے سے چند روز کے لیے آیا ہوں ۔

'بڑی خوشی ہوئی ۔ اندر تشریف رکھیے '۔ کیفیؔ نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا ۔

'آپ کی بڑی عنایت ہوگی اگر آپ دوسرے ادیبوں سے میرا تعارف کرا دیں کیونکہ میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں پہچانتا ۔ میں نے گزارش کی ۔

ہاں ہاں ضرور ملا دوں گا ۔ ابھی تشریف رکھیے ۔ وہ دیکھیے مہندر ناتھ کھڑے ہیں ۔ (مہندر ناتھ کچھ فاصلے پر کھڑے تھے ۔ ان کو مخاطب کرتے ہوئے) مہندر جی ! اِن سے ملیئے ۔ یہ ڈھاکے سے آئے ہیں ۔ کیفیؔ نے اپنی جگہ سے ٹلے بغیر یہ سب کچھ کہہ دیا ۔

میں مہندر ناتھ کی طرف بڑھ گیا ۔ ان سے مصافحہ کیا ۔ اُنھوں نے پوچھا آپ ڈھاکے سے تشریف لائے ہیں ؟

میں جی ہاں

مہندر وہاں کے حالات کیسے ہیں ؟ (اس سوال کا پس منظر

یہ ہے کہ میرے بمبئی پہنچنے سے دو ایک ماہ قبل ڈھاکے بلکہ مشرقی پاکستان میں ہندو مسلم فسادات ہو چکے تھے۔

میں   حالات پُرامن ہیں۔ کرشن چندر صاحب ابھی تک آئے یا نہیں ؟

مہندر   اب آتے ہی ہوں گے۔ تشریف رکھیئے۔

میں   ہاں بیٹھتا ہوں۔ لیکن آپ اتنی زحمت ضرور کریں کہ جب کرشن چندر صاحب اور دوسرے ادبا آجائیں تو ان سے میرا تعارف کرا دیں۔ میں نے کسی کو دیکھا نہیں ہے پہچاننے میں دقت ہو گی۔

مہندر   ضرور ضرور

ہال کے اندر فرش پر دس بارہ اصحاب بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سب سے پچھلی صف میں بیٹھ گیا۔ ایک طرف چار پانچ جواں سال خواتین بھی تھیں۔ میرے بیٹھنے کے دس پندرہ منٹ بعد عصمت اور کرشن چندر آئے۔ مجھے ان کی تصویریں اچھی طرح یاد تھیں۔ اس لیے ان دونوں کو بیک نظر پہچان گیا۔ توقع ہوئی کہ شاید اب کیفی یا مہندر ان دونوں سے میرا تعارف کرائیں گے۔ لیکن یہ دونوں ہال میں آکر اگلی صف میں بیٹھ گئے اور کرشن چندر اور دوسرے ادبا کی گفتگو میں شریک ہو گئے۔ کچھ دیر بعد مہندر نے کھڑے ہو کر جلسے کی کارروائی کے آغاز کا اعلان کیا اور صدارت کے لیے ایک غیر معروف نوجوان کا نام پیش کیا۔ اس کے بعد مہندر نے سکرٹری کی حیثیت سے گزشتہ جلسے کی روداد سنائی جس میں تنقید یا اعتراض کی گنجائش نہیں پائی گئی۔ اس جلسے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں عصمت نے اپنا مشہور افسانہ 'چوتھی کا جوڑا' پڑھا۔ جب وہ افسانہ پڑھ چکیں تو صدر نے حاضرین کو اس پر عمل براحی کی دعوت دی۔ کوئی اس کے لیے کھڑا نہ ہوا تو سب کی نگاہیں کرشن چندر پر مرکوز ہو گئیں وہ مسکراتے ہوئے اُٹھے۔ ان کی مسکراہٹ نے حاضرین کے

چہروں میں بھی ایک متبسمانہ کیفیت پیدا کردی۔ اُنھوں نے عصمت کے افسانے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ عصمت نے بہت عرصے کے بعد ہمیں ایک اچھا افسانہ دیا ہے۔ اس میں ان کا پرانا رنگ بھی ہے اور نیا رنگ بھی۔ پرانے رنگ سے میرا مطلب ان کی شاعری سے ہے جو اس افسانے میں کی گئی ہے . . . . .
مجھے کرشن چندر کی پوری تقریر یاد نہیں رہی ۔ آخر میں اُنھوں نے یہ کہا تھا کہ اس افسانے میں چوتھی کا جوڑا کفن بن جاتا ہے یہ کفن دراصل ہماری بوسیدہ سماج کا کفن ہے ۔اس جملے پر واہ واہ کے ساتھ تالیاں بھی بجیں ۔

جب وہ اظہارِ خیال کر چکے تو آئندہ جلسے کا پروگرام مرتب کیا جانے لگا۔ مہندر نے کہا۔ آئندہ جلسے میں جن صاحبان کو پڑھنا ہے وہ اپنے نام لکھوائیں۔ کسی نے کہا ۔ راجندر سنگھ بیدی (جو اس جلسے میں موجود تھے) کا نام لکھیئے افسانہ پڑھیں گے۔ کسی نے کہا۔ کیفی اعظمی کا نام لکھیئے۔ نظم پڑھیں گے۔ کسی نے کہا وشوامترا عادل کا نام لکھیئے۔ مضمون پڑھیں گے۔ کرشن چندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہاں جب تک ان لوگوں سے لکھوایا نہیں جائے گا یہ لکھیں گے نہیں۔ مہندر نے آئندہ جلسے کا پروگرام سناتے ہوئے کہا۔

راجندر سنگھ بیدی افسانہ پڑھیں گے۔
کیفی اعظمی نظم پڑھیں گے۔
وشوامتر عادل مقالہ پڑھیں گے۔

' اور مہندر جی رپورٹ پڑھیں گے ' کرشن چندر نے برجستہ چوتھا مصرع لگادیا۔ تمام حاضرین ہنس پڑے۔

جلسے کے بعد کیفی اور مہندر نے مجھے راجندر سنگھ بیدی، وشوامتر عادل محمد مہدی اور کرشن چندر سے ملایا۔ کرشن چندر نے مجھے عصمت چغتائی سے ملایا جو قریب ہی کھڑی تھیں۔ میں نے کرشن چندر اور عصمت دونوں سے ان کے گھر پر ملنے کی اجازت چاہی۔ چونکہ کرشن چندر کا گھر شہر سے بہت دُور تھا

اس لیے یہ طے پایا کہ میں کرشن چندر سے مہندر ناتھ کے یہاں ایک اور دو بجے کے درمیان ملوں۔ مہندر ناتھ بمبئی کے مشہور فلمی علاقے دادر میں رہتے تھے۔ کرشن چندر ہر روز ان کے یہاں ایک دو بجے کے درمیان آتے تھے۔ عصمت نے مجھے آئندہ اتوار کو صبح کے دس بجے گھر پر ملنے کی اجازت دے دی۔ راجندر سنگھ بیدی نے یہ وعدہ کر لیا کہ آئندہ اتوار کو جلسے کے بعد وہ شام میرے ساتھ گزاریں گے۔

اس وعدے وعید کے دوران ایک دل چسپ گفتگو سن لینے کا اتفاق ہوا۔ عصمت سے کچھ دور ایک طرف کرشن چندر، مہندر ناتھ اور ایک اور صاحب باتیں کر رہے تھے۔ موخر الذکر نے کہا۔ آج کے جلسے میں ایک نئی اور حسین صورت دیکھنے میں آئی۔

'کون؟ وہ جو . . . . کے برابر بیٹھی ہوئی تھی؟' مہندر نے پوچھا۔

'ہاں' اس شخص نے جواب دیا۔

'بڑی تندرست ہے' مہندر نے اظہار خیال کیا۔

'تندرست کیوں نہ ہو کمیونسٹ جو ٹھہری' کرشن چندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مہندر ناتھ کے گھر پہنچنے کے لیے مجھے بڑے چکر لگانے پڑے۔ میں ان کے ہاں پہنچنے سے مایوس ہو چکا تھا۔ لیکن آخری کوشش یا یوں کہیے کہ آخری چکر کامیاب رہا۔ ان کے دروازے پر دستک دی۔ اُنھوں نے دروازہ کھولا۔ ان کے چہرے کا رنگ بتا رہا تھا کہ میری دستک پر نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ خندہ پیشانی سے اُنھوں نے کہا۔ آیئے۔ ایک قدم کمرے کے اندر رکھ کر میں رُک گیا۔ رُکنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کمرے میں ایک تخت پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور ایک صوفے پر ایک جواں سال عورت سوئی ہوئی تھی۔ مہندر نے میری ہچکچاہٹ دیکھ کر کہا۔ آجایئے۔ جب میں کمرے

کے اندر داخل ہو گیا تو مہندر نے دروازہ بند کر لیا اور مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ میرے برابر ایک چوکی بچھی ہوئی تھی جس پر ایک صاحب سو رہے تھے۔ میں نے ان کو کل کے جلسے میں نظم پڑھتے دیکھا تھا۔ کمرہ نہ بہت چھوٹا تھا نہ بہت کشادہ۔ مہندر سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کی قیام گاہ صرف اسی کمرے سے عبارت ہے۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر میرے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوئے۔ یہ عورتیں کون ہیں؟ شکل و صورت اور رنگ کے اعتبار سے تو انھیں مہندر کے قریبی رشتے داروں میں شمار کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ کرشن چندر اور مہندر ناتھ دونوں خوبصورت اور صاف رنگ کے مالک ہیں۔ مگر یہ عورتیں نہ صرف سانولی ہیں بلکہ ان کے چہرے کے خطوط بھی بھدے ہیں۔ مہندر کرشن چندر کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟ کرشن چندر پر لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ وہ ایک بڑی کوٹھی میں رہتے ہیں جس کے صرف دو ایک کمرے ان کے استعمال میں رہتے ہیں۔ باقی کمروں میں ان کی مہمان نوازی سے فائدہ اُٹھانے والے دوست احباب رہا کرتے ہیں۔ کیا مہندر کے لیے ان کے مکان میں کوئی جگہ نہیں؟ لیکن ان موضوعات پر مہندر سے گفتگو کرنا مناسب معلوم نہ ہوا۔

میں مہندر کے ہاں تین بجے پہنچا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کرشن چندر اس وقت تک چلے گئے ہوں گے۔ مگر میری خوش قسمتی کہ اس دن وہ اس وقت تک آئے بھی نہ تھے۔ جب تک وہ نہیں آئے مہندر سے گفتگو ہوتی رہی۔ میں ان سے بمبئی کی ادبی صورت حال پوچھتا رہا۔ اسی سلسلے میں خواجہ احمد عباس کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے پوچھا کیا اب وہ آپ لوگوں کے جلسے میں کبھی نہیں آتے۔ مہندر نے کہا۔ ہاں جب سے اختلاف پیدا ہوا ہے وہ شرکت نہیں کرتے۔ لیکن اُمید ہے کہ وہ پھر ہمارے حلقے میں آجائیں گے۔ مہندر نے

خواجہ احمد عباس کے نقطۂ نظر کی کوتاہیاں اجاگر کرتے ہوئے کئی باتیں کہیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جو شخص گاندھی ازم کا پیرو ہے وہ کبھی ترقی پسند نہیں ہو سکتا۔

میں نے پوچھا۔ آج کل ساحر لدھیانوی کہاں ہیں۔ مہندر نے بتایا کہ کرشن چندر کے ساتھ رہتے ہیں۔ مگر انجمن کے جلسوں میں اس لیے شریک نہیں ہوتے کہ ہم لوگوں سے کسی قدر ناراض ہیں۔

مہندر نے سردار جعفری اور میراجی کی باہمی چشمک کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میراجی احساس برتری کے مرض میں مبتلا تھے۔ وہ سردار جعفری کو اپنے مقابلے میں فروتر سمجھتے تھے۔ سردار کو ان کا یہ رویہ قدرتی طور پر کھلتا تھا۔ چنانچہ وہ بھی میراجی کے احساس برتری کو ضرب لگانے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

ایک مرتبہ سردار نے 'نیا ادب' کے لیے میراجی سے غزل مانگی۔ میراجی نے ایک غزل دے دی۔ سردار نے اسے شائع کرنے کا وعدہ کرلیا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد غزل میراجی کو واپس کر دی اور کہا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں۔ اُنھیں دُور کر دیجیئے تو غزل شائع کی جائے گی۔ میراجی کو یہ بات بہت بری لگی اور اُنھوں نے دوبارہ غزل نہیں دی۔

مہندر نے بتایا کہ سردار نے ان کی غزل واپس کر دی تو ایک دن میراجی مجھ سے کہنے لگے۔ کمیونسٹ بڑے کمینے ہوتے ہیں۔ اس پر میں نے کہا تم بھی تو کمینے ہو۔ ذرا سی بات پر کدورت رکھتے ہو۔ سردار نے 'نیا ادب' میں تمھاری غزل شائع نہیں کی تو اس سے تمھاری شان میں کون سی کمی آگئی۔ کمیونسٹوں میں کچھ لوگ کمینے ضرور ہیں۔ لیکن چند لوگوں کی بنا پر پوری جماعت اور تحریک کو بدنام کرنا کہاں کا انصاف ہے اور جو لوگ غیر اشتراکی ہیں کیا ان میں کمینے نہیں ہوتے؟

اتنی گفتگو کے بعد کرشن چندر آ گئے ۔ ان کی آمد کے ساتھ ساتھ بے تکلفی کی وہ فضا جاتی رہی جس میں مہندر سے باتیں ہو رہی تھیں ۔ میں کہ اس زمانے میں بی اے کا ایک طالب علم تھا کرشن چندر کی ادبی عظمت سے تو مرعوب تھا ہی ان کے طنز نگار ہونے کے خیال سے اور بھی پریشان تھا ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نشانہ بن جاؤں ۔ مزاح نگاروں اور طنز نگاروں کی طرف سے اس قسم کے اندیشے کا لاحق ہونا فطری بات ہے ۔

کرشن چندر نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا ۔ آپ بمبئی پہلی بار آئے ہیں ۔ میں نے کہا جی ہاں ۔ کرشن چندر نے پھر سوال کیا ۔ آپ نے بمبئی کو کیسا پایا ۔ اس سوال و جواب سے فارغ ہونے کے بعد میں نے گفتگو کو ادب کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا ۔ کرشن جی ! آج کل کون کون سی چیزیں زیرِ تصنیف ہیں ۔

کرشن چندر کچھ بھی نہیں ۔ جمود طاری ہے ۔

میں ایک لحاظ سے تو پورے اردو ادب پر جمود طاری ہے ۔

مہندر نہیں تو ۔ اچھی کتابیں اور رسالے تو کافی شائع ہو رہے ہیں ۔

میں میرا مطلب یہ نہیں کہ لکھنے والوں نے لکھنا ترک کر دیا ہے بلکہ یہ کہ آج کل ایسی چیزیں نہیں لکھی جا رہی ہیں جنھیں معرکہ آرا کہا جا سکے ۔ نوخیز لکھنے والوں سے ایسے فن پاروں کی توقع زیادتی ہوگی اور جو لوگ پختہ کار ہیں وہ اتنی عمدہ چیزیں پیش نہیں کر رہے ہیں جتنی کہ وہ کر چکے ہیں ۔ مثال کے طور پر خود کرشن جی کو لے لیجئے ۔ آپ کا نام آتے ہی ذہن 'ان داتا' کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے آپ کے قلم سے 'ان داتا' کے پائے کی کوئی دوسری چیز اب تک پڑھنے والوں کو نہیں ملی ۔

مہندر   نہیں نہیں۔ 'ان داتا' کے بعد بھی اس درجے کی چیزیں لکھی گئی ہیں۔ آپ نے 'لکشمی کا پل' پڑھا۔

میں   جی ہاں میں نے پڑھا ہے۔ پسند بھی کیا ہے۔ لیکن مجھے تو اُس درجے کی چیز نہیں معلوم ہوتا۔

مہندر   اور 'برہم پترا' جو 'شاہراہ' میں شائع ہوا تھا آپ کی نظر سے گزرا یا نہیں؟

میں   نہیں۔

مہندر   تو اسے پڑھیئے۔ 'ان داتا' سے بھی بلند تر تخلیق ہے۔

میں   اچھی بات ہے پڑھوں گا۔

کرشن چندر   صاحب! مختصر ڈریبٹ لکھتے ہیں تو ہمیں لوگ اور فورینہ ریبٹ لکھتے ہیں تو ہمیں لوگ۔ اعتراض کرنے والے تو کبھی اس کمی کو پورا کر کے نہیں دکھاتے۔

میں نے محسوس کیا کہ جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی جاتی ہے مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ میں ناگوار حد تک صاف گوئی سے کام لے رہا ہوں۔ چنانچہ میں نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔ ادھر کئی سال سے آپ کے ایک ناول 'گدھ' کا اشتہار دیکھتا رہا ہوں۔ اس کی طباعت میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔

کرشن چندر   وہ ناول لکھا ہی نہیں گیا۔ سو ڈیڑھ سو صفحات لکھ کر میں نے چھوڑ دیا۔

مہندر   آج کل ایک دوسرا ناول لکھ رہے ہیں (کرشن کی طرف روئے سخن کر کے) تقریباً نصف حصے تک پہنچ چکے ہیں۔

کرشن چندر   قریب قریب۔

کرشن چندر نے اب جانے کا خیال ظاہر کیا۔ ان کے اُٹھنے سے پیشتر

میں نے کہا۔کرشن جی! معاشیات کی ایک کتاب میں مَیں نے پڑھا تھا کہ ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔آج یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ ایک طرف آپ لوگوں کا وقت ضائع ہوا ہے۔دوسری طرف میں آپ لوگوں سے مستفید ہوا ہوں۔

کرشن چندر   یہ آپ نے سرمایہ داروں کی ایکونومکس میں پڑھا ہوگا۔ اشتراکی معاشیات میں ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان نہیں ہوتا۔(مہندر کی طرف روئے سخن کرکے) سرمایہ دارانہ معاشیات کس قدر گمراہ کن ہے۔اگر میں نے بی اے میں کارل مارکس کی کتاب نہ پڑھی ہوتی تو میرا دماغ خراب ہوگیا ہوتا۔

کرشن چندر کے ان جملوں سے میں کچھ خفیف سا ہوگیا۔وہ جانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔میں نے اُٹھ کر مصافحہ کیا۔مصافحہ کرتے وقت اُنھوں نے پوچھا۔ابھی تو بمبئی میں آپ کا قیام رہے گا۔

میں   جی ہاں

کرشن چندر   آئندہ جلسے میں آپ شریک ہوں گے۔

میں   خیال تو ہے۔

کرشن چندر   اچھا تو پھر وہاں ملاقات ہوگی۔

کرشن چندر کے جانے کے بعد میں نے مہندر سے کہا۔اب مجھے بھی اجازت دیجیے۔آپ کا بہت وقت لے چکا۔مہندر نے کہا کوئی حرج نہیں۔ ابھی بیٹھیے۔میں نے جانے پر اصرار نہیں کیا اور بیٹھ گیا۔

کسی عنوان سے میرے اور مہندر کے درمیان کرشن چندر کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔اس سلسلے میں مہندر نے ایک دل چسپ بات بتائی۔اُنھوں نے کہا جب میرا کسی سے تعارف کرایا جاتا ہے تو اکثر نام بتانے سے پہلے یہ

کہہ دیا جاتا ہے کہ کرشن چندر کے چھوٹے بھائی ہیں۔ مجھے اس جملے سے بڑی کوفت ہوتی ہے گویا میری اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ کل کے جلسے میں راجندر سنگھ مجھ پر طنز کر گئے۔ انھوں نے کرشن چندر سے اپنے چھوٹے بھائی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ یہ میرے مہندر ناتھ ہیں۔ میں اس پر ایک بہت سخت جملہ کہنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے خاموش رہ گیا کہ شاید ناگوار گزرے۔

'آپ کون سا جملہ کہنا چاہتے تھے؟' میں نے بڑے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

'میں یہی کہتا کہ مہندر ناتھ بننے کے لیے صلاحیت چاہیے'۔ مہندر نے جواب دیا۔

مہندر کے ہاں کرشن چندر کے آنے کے کچھ دیر بعد دو اور صاحبان کمرے میں آ گئے تھے۔ جب میں مہندر سے رخصت ہونے لگا تو میں نے ان دونوں سے بھی مصافحہ کیا اور مہندر سے پوچھا، آپ کی تعریف؟

آپ محمد علی ہیں۔ کرشن چندر کے پرائیویٹ سکرٹری اور یہ میرے چھوٹے بھائی ہیں۔' مہندر نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

میں — گویا آپ تین بھائی ہیں۔

مہندر — جی ہاں — اور ایک بہن

میں — سرلا دیوی؟ جن کی شادی حال ہی میں ہوئی ہے؟

مہندر — جی ہاں

میں — آپ کی بھی شادی ہو چکی ہو گی؟

مہندر — جی ہاں

میں — آپ کے بچے بھی ہیں؟

مہندر — (مسکراتے ہوئے) ابھی بچے نہیں ہوئے۔

ان سوالات کے بعد جن کا مناسب ہونا آج تک مشکوک ہے

میں مہندر ناتھ سے رخصت ہوا۔ اب جب کہ خود مہندر ناتھ، سرلا دیوی اور کرشن چندر بزمِ ہستی سے رخصت ہو چکے ہیں اُن سے متعلق یادوں کو تازہ کرنا بھی بزمِ ہستی کی روشنی اور رونق کو تقویت پہنچانے کے برابر ہے۔

۳۰/ اپریل ۱۹۷۷ء

ابن انشا ـــ سرسری جن سے ملاقات تھی گاہے گاہے

اپنے ایک کالم میں ابن انشا نے لکھا تھا ،۔

"اور اب اس نئے آنے والے سال سے خوف آتا ہے جس کا حساب پہلی جنوری سے شروع ہو گا۔ دیکھیے اس خزاں میں کون کون سا پتہ ٹوٹتا ہے۔ اس سال کے حصے میں کون کون سی عزیز ہستی آتی ہے۔ سارے نام کہیں نہ کہیں کسی لوح میں محفوظ ہوں گے۔ اچھا ہے کہ یہ لوح محفوظ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جانے والوں کو جانے کے دن کی خبر نہیں ہوتی اور وہ دمِ آخر تک جی لیتے ہیں۔ کیا عجب انہی میں سے کسی لوح پر ان سطور کے راقم کا نام بھی رقم ہو۔ آخر ہم جمالی سے زیادہ زندہ اور فعال، عباسی سے زیادہ صاحبِ عزم اور ممتاز حسن سے زیادہ صحت مند تھوڑا ہی ہیں۔"

یہ کیسا اتفاق ہے کہ جمالی ، عباسی ، ممتاز حسن ، وقار عظیم اور ابراہیم جلیس کا ماتم گسار ابنِ انشا آج خود وجہ ماتم بنا ہوا ہے اپنے اندیشے کے مطابق اُسی جنوری میں جس سے نیا سال شروع ہوتا ہے۔ اِس پتے کو اسی خزاں میں ٹوٹنا تھا۔ وہ شخص جو دوسروں پر تعزیتی کالم لکھتا تھا آج خود تعزیتی کالم کا موضوع بن چکا ہے۔ لیکن اس کے لکھے ہوئے کالموں میں صدمہ رسیدہ دلوں کے لیے جو مرہم ہوتا تھا وہ اس پر لکھے ہوئے کالموں میں کہاں سے آئے ۔

مرنے والوں کی عمر کچھ بھی ہو موت ہر حال میں ماتم طلب ہوتی ہے۔ لیکن جو

لوگ اپنی عمر کے اعتبار سے موت کے حقدار نہ ہوں اور اپنی کارکردگی اور کارنامے کے اعتبار سے حد درجہ محبوب اور محترم رہے ہوں ان کا ماتم جینے والوں کے لیے کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔ ابنِ انشا اور حسن عسکری کی موت بھی ایسی ماتم سخت است کے ذیل میں آتی ہے اور اس پر غالب کے الفاظ میں یہ کہے بغیر رہا نہیں جاتا کہ بچ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور ۔

موت کی خرابی یہ نہیں کہ وہ انسان کا مقدر ہے۔ انسان کے مقدر کا المیہ یہ ہے کہ موت اس دُکھی دُنیا میں دُکھ کی دوا بن کر کم آتی ہے اور دُکھ میں اضافہ بن کر زیادہ ۔ جو لوگ دوسروں کے لیے روشنی اور صحت کی حیثیت رکھتے ہیں نہ جانے وہ قبل از وقت کیوں اُٹھا لیے جاتے ہیں ۔ لیکن زندگی اور موت کے بھید کب کھلے ہیں جو اب کھلیں گے ۔

بیسویں صدی جیسے پُر آشوب عہد اور پاکستان جیسے پُر انتشار ملک میں ابن انشا جیسے ادیب کے کالم ٹھٹھرتی ہوئی تاریکی میں دُھوپ اور روشنی کی حیثیت رکھتے تھے۔ غم نصیب انسانیت کے حق میں اچھے مزاح نگاروں کا وجود زندگی کی بہترین نعمت سے کم نہیں ۔ اس نعمت کے چھن جانے پر جتنے بھی آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔

ابن انشا سے میری ملاقاتیں کئی تھیں لیکن ان سے ذاتی تعلقات نہ ہونے کے برابر تھے۔ جی ضرور چاہتا تھا کہ ایسے دلکش شعر کہنے والے اور ایسی دل چسپ نثر لکھنے والے سے ملاقاتیں تعلقات میں تبدیل ہو جائیں لیکن یک طرفہ جذبہ نہ دوستی کی شکل اختیار کرتا ہے نہ محبت کی۔ میں اپنے آپ کو کسی پر نافذ کرنے کا نہ قائل ہوں نہ عادی ۔

لیکن ابن انشا کی شاعری اور نثر نگاری اُس دُوری کے باوجود جو میرے ان کے درمیان حائل تھی میری توجہ کا مرکز اور میری دل چسپی کا محور ضرور رہی ۔ مجھ پر ایک زمانہ وہ گزرا جب ان کے بعض شعر میری تنہائیوں کی گنگناہٹ بن گئے۔ آج بھی جب ان کے یہ شعر یاد آتے ہیں تو ذہنی اور جذباتی طور پر میں تھوڑی دیر کے لیے

کسی اور فضا میں منتقل ہو جاتا ہوں ؎

اب جو ہونے کے قصے سبھی ہو چکے، تم ہمیں کھو چکے ہم تمھیں کھو چکے
آگے دل کی نرباتوں میں آنا سجن کہ یہ دل ہے سدا کا دوانا سجن
شہر کے لوگ اچھے ہیں، ہمدرد ہیں پر ہماری سنو ہم جہاں گرد ہیں
داغ دل نہ کسی کو دکھانا سجن، یہ زمانہ نہیں وہ زمانا سجن
اُس کو مدت ہوئی صبر کرتے ہوئے، آج کوئے وفا سے گزرتے ہوئے
پوچھ کر اس گدا کا ٹھکانا سجن، اپنے انشا کو بھی دیکھ آنا سجن

مجھے یقین ہے کہ اگر اس غزل کو بھی استاد امانت علی کی آواز میسر آ گئی ہوتی یا ان کے صاحبزادے استاد اسد امانت علی کی آواز میسر آ جائے تو یہ غزل بھی کل انشا جی اُٹھو اب کوچ کرو" والی غزل کی طرح مقبول ہو جاتی اور کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص اپنی نثر میں مسکراہٹوں کا سرمایہ دار اور تقسیم کار نظر آتا ہے وہ اپنی شاعری میں حزن و ملال کا شکار کیوں تھا۔ شاید اس لیے کہ زندگی کی بہت سی نعمتیں بھی انسان کو مسرور و مطمئن رکھنے کے لیے کافی نہیں جب کہ اس کی صرف ایک محرومی اسے دل شکستہ و دل گرفتہ رکھنے میں کبھی ناکام ثابت نہیں ہوتی۔

انشا کی شاعری کا مزاج میر تقی میر اور نظیر اکبر آبادی کے ملے جلے اثرات سے بنا ہے۔ اس میں میر کی دل زدگی اور نظیر کی وارستگی دونوں عناصر کی کارفرمائی ملتی ہے۔ انشا نہ صرف جذباتی طور پر میر اور نظیر سے قریب تھے بلکہ فنی طور پر بھی۔ میر اور نظیر کی لمبی بحریں انشا کی طبیعت سے خاص ہم آہنگی رکھتی تھیں۔ نفس مضمون کے اعتبار سے انشا کی شاعری میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ دراصل ان کی شاعری ایک

خاص لے اور لہجے کی شاعری ہے۔ اسے پڑھتے یا سُنتے وقت ایک نئے ذائقے کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

بے ساختگی جو ان کی شاعری کا ایک نمایاں عنصر ہے وہ ان کی نثر کی بھی ایک امتیازی صفت ہے۔ اتنی بے ساختہ نثر اور اتنا بے ساختہ مزاح اردو میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ اردو اخباروں کے بیشتر مزاح نگاروں کے کالم مجھ سے پڑھے نہیں جاتے۔ ان کالموں کے مقابلے میں سنجیدہ مضامین کو پڑھ جانا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انشا کسی بھی موضوع پر لکھ رہے ہوں ان کے کالم ضرور ہوتے تھے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کے یہاں خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کے سفرنامے چین اور جاپان ہی کے نہیں پنڈی اور مری کے بھی مزے دار ہیں۔ بعض اوقات وہ ادبی اور ثقافتی جلسوں اور کتابوں کی تقریب رونمائی کو بھی موضوع بنا لیتے تھے لیکن ان موضوعات پر ان کے کالموں کو پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ آج اُنھوں نے اپنے کالم کی خانہ پری کر کے اپنے پیسے کھرے کر لیے۔ کبھی کبھی ان کے کالموں کے ذیلی عنوان ہی اتنے مزے دار ہوتے تھے کہ ان میں پورے کالم کا لطف آجاتا تھا۔ مثلاً

کشور ناہید اردو ادب کی کیا لگتی ہیں۔ کیا والدین کا ہونا ضروری ہے۔ وہ خون کھولا دینے والے موضوعات پر بھی قلم اُٹھاتے تو تلخی اور ترشی کو راہ نہ دیتے اپنی خوش طبعی اور خوش دلی کو برقرار رکھتے۔ بنیادی طور پر وہ مزاح نگار تھے۔ مزاح نگار کا کام زندگی کی لایعنیت اور دُنیا کی بے قاعدگی سے خود محفوظ ہونا اور دوسروں کو محفوظ کرنا ہے۔ ایک مرتبہ کراچی کے بعض قصابوں نے لوگوں کو گدھے کا گوشت کھلا دیا۔ انشا نے کالم لکھا تو اپنی اس خوش قسمتی پر خدا کا شکر ادا کیا کہ ان دنوں وہ لاہور میں تھے۔ اس سانحے پر انھوں نے قصابوں کی مذمت نہیں کی البتہ گدھوں سے ہمدردی ضرور ظاہر کی۔ سیاسی حالات و شخصیات کے بالواسطہ حوالوں سے مزاح پیدا کرنے کا گُر اُنھیں خوب

آتا تھا۔ ایک کالم جو کوئٹہ کا سفرنامہ ہے یوں شروع ہوتا ہے :۔
'ہم نے کوئٹہ جانے کے لیے کتابوں کی گٹھڑی باندھی تو لوگوں نے کہا۔ ہے ہے یہ کیا کر رہے ہو۔ کیا اُلٹی گنگا بہا رہے ہو۔ لوگ پہاڑوں سے اُتر رہے ہیں۔ تم پہاڑوں پر چڑھ رہے ہو۔ لوگ ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ تم ہتھیار اُٹھا رہے ہو۔ ہم نے کہا۔ صاحبو! کون سے ہتھیار۔ ہمیں تو اس لفظ ہی سے الرجی ہے۔ ہمارا تو اسلحے کا نام سن کر ہی پتّہ پانی ہو جاتا ہے۔ فرمایا۔ کتابوں سے بڑا ہتھیار کیا ہو سکتا ہے ؟'

آج کل نثری نظم کا جو شور و غل ہے اسے ذہن میں رکھیے اور عطاء الحق قاسمی کے نام انشاؔ کے خط کے یہ جملے پڑھیے :۔
'. . . . صرف کج فہم اور جہل نصیب لوگوں کو وہ (میری کتاب) سطحی نظر آئے گی۔ کہیں کہیں الف اور بیشتر جگہ آپ مضمون کرتا پائیں گے۔ اس کو نظر انداز کرنا بہتر ہوگا ورنہ میں نثری نظم لکھنے والوں کے ہاتھ مضبوط کرنا شروع کر دوں گا اور آپ پچھتائیں گے۔

ابنِ انشاؔ کے مزاح میں بعض اوقات معصوم شرارت یا شرارت آمیز معصومیت ایک عجب مزہ دے جاتی ہے۔ عبدالعزیز خالد نے ایک مرتبہ انشاؔ کے پاس کوئی کتاب بھیجی جس میں اُنھوں نے دُنیا کے بعض بڑے لکھنے والوں کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ انشاؔ لکھتے ہیں :۔
'میں نے تمھیں ہمیشہ ایک محبِ صادق سمجھا لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ تم خراجِ عقیدت پیش کرتے وقت ہمیں تو بھول جاتے ہو اور ایسے ایسوں کے نام لکھتے ہو جو بوجہ فوت ہو جانے کے نہ تمھیں فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ پشکن اور سوفکلیز وغیرہ کون تھے۔ کچھ ہمیں بھی پتا چلے۔ کیا ہم سے بہتر لکھتے تھے اور ہم سے زیادہ تمھارا خیال رکھتے تھے . . . . .'

میرا اندازہ ہے کہ انشاؔ کے ذاتی خطوط ان کے کالموں سے کچھ کم دلچسپ

نہ ہوں گے۔ کیا عجب کہ وہ کالموں سے کچھ زیادہ ہی دلچسپ ہوں۔ کاش کوئی انشاؔ کے کالموں کا ایک انتخاب اور ان کے ذاتی خطوط کا مجموعہ شائع کر ڈالتا۔

انشاؔ کے کالم کا ایک ضمنی جملہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ انھوں نے اپنے کسی کالم میں طول نگاری کی مذمت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اب مثال کے طور پہ جوشؔ ملیح آبادی ہی کو لے لیجیے۔ جب انھیں کچھ نہیں کہنا ہوتا تو وہ ستر ستر بند کی نظمیں لکھتے ہیں اور جب انھیں فی الواقع کچھ کہنا ہوتا ہے تو وہ چار مصرعوں کی رباعی لکھتے ہیں۔

مجھے اس جملے کو پڑھ کر اتنا ہی لطف آیا تھا جتنا کہ اشفاق احمد کے ایک جملے کو سن کر جو اُن کے مشہور و مقبول ریڈیو پروگرام 'تلقین شاہ' میں تھا۔ تلقین شاہ اپنے ساتھی کردار کی خلافِ معمول خاموشی پر پیچ و تاب کھا رہے ہیں اور اس سے بار بار کچھ بولنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ ساتھی کردار زمانے کی نزاکت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کہتا ہے۔ شاہ جی! اب میں نے طے کر لیا ہے کہ خاموش ہی رہوں گا۔ اس پر تلقین شاہ بگڑ کر فرماتے ہیں تم خاموش رہنے پر مصر ہو تو خیر لیکن تمھاری خاموشی میں بھی گرامر کی سو غلطیاں ہیں۔

جس طرح اشفاق احمد کا یہ جملہ طنز و مزاح کا بہترین شاہکار ہے اسی طرح جوشؔ سے متعلق ابنِ انشاؔ کا جملہ بھی طنز و تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔

۱۹۷۳ء میں جب مختار مسعود کی کتاب 'آوازِ دوست' کی تعارفی تقریب پنڈی میں ہو رہی تھی تو اس میں حسنِ اتفاق سے انشاؔ بھی موجود تھے۔ 'آوازِ دوست' پر مضمون پڑھنے والوں میں مَیں بھی تھا اور 'بجنگ آمد' کے مشہور و مقبول مصنف کرنل محمد خان بھی۔ تقریب کے آغاز سے پہلے چائے کا دَور چلا۔ کرنل محمد خان سے میری ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں اُنھوں نے ٹھنڈ کے اثر سے اپنے گلے کی تکلیف کا ذکر کیا۔ اگرچہ ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور عمر میں بھی وہ مجھ سے بڑے ہیں پھر بھی مجھے شوخی سوجھی اور میں ان پر ایک فقرہ چست کر گیا۔ کہنے لگے ــــ ابھی ابھی

ابنِ انشا بھی اسی طرح کا فقرہ کہہ گئے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ سمجھ میں نہیں آتا گلے میں اتنی تکلیف ہے۔ مضمون کیسے پڑھوں تو اُنھوں نے برجستہ کہا۔ آج آپ تحت اللفظ ہی پڑھ دیجیے۔

انشا سے میری آخری ملاقات ۹۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو پنڈی میں ہوئی۔ میں شام کے وقت پنڈی کے مشہور ورائٹی بک اسٹال کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اچانک دیکھا کہ ورائٹی کے سامنے ایک کار رکی اور پچھلے دروازے سے ابنِ انشا باہر آئے و ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو میں ان کے قریب گیا۔ ہاتھ ملاتے ہوئے اُنھوں نے مجھ سے ملاقات کے نہ ہونے کی شکایت کی لیکن اس شکایت میں مل بیٹھنے کی کوئی خواہش ہمراہ نہ تھی اس لیے میں نے کہا کہ اگر پنڈی میں ابھی آپ کا قیام ہے تو پھر ملاقات ہوگی اور یہ کہہ کر ان سے رخصت ہو لیا۔ ابھی کچھ ہی دُور گیا تھا کہ ان کی آواز نے میرا تعاقب کیا۔ اُنھوں نے بلند آوازی سے پکارا۔ نظیر صاحب! میں نے مڑکر دیکھا تو وہ مجھے اشارے سے بلاتے نظر آئے۔ میں اُن کی طرف واپس آنے لگا تو دیکھا کہ اُنھوں نے کار کا دروازہ کھول کر ایک کتاب نکالی اور اس پر کچھ لکھنے لگے۔ میں ان کے قریب آیا تو اُنھوں نے کہا۔ بھئی ایک کتاب لیتے جایئے۔ یہ کتاب تھی 'اُس بستی کے اک کوچے میں'۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ قدرت اللہ شہاب ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان سے بھی علیک سلیک ہوئی۔ خیال آیا کہ ان دونوں سے ضمناً ایک بات کا ذکر کر دوں۔ میں نے کہا کہ پیپلز (علامہ اقبال) اوپن یونیورسٹی میں ہم لوگ اردو کا جو نصاب ترتیب دے رہے ہیں اس میں آپ دونوں حضرات کی تحریریں بھی ہیں۔ اس سلسلے میں آپ دونوں کی اجازت کے لیے باضابطہ خط آپ کے نام جانے والا ہے۔ اس پر انشا نے کہا جب تک آپ اوپن یونیورسٹی میں ہیں میری جو تحریر بھی آپ استعمال کرنا چاہیں کریں۔ اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔ قدرت اللہ شہاب نے بھی اسی طرح کی اجازت دے دی۔ اس وقت

کیا خبر تھی کہ ابن انشاؔ سے یہ میری آخری ملاقات بھی ہے اور مجھ پر ان کی یہ آخری کرم فرمائیاں بھی ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

۲۳ر جنوری ۱۹۷۸ء

ڈاکٹر احسن فاروقی

سالِ رواں اردو ادب پر بہت بھاری پڑ رہا ہے۔ دو مہینے کے اندر فرید جاوید، ابنِ انشا، حسن عسکری، صوفی تبسم جیسی شخصیتوں کے بعد ڈاکٹر احسن[1] فاروقی بھی اچانک داغِ مفارقت دے گئے۔ ابھی تین چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ ایم اے کے انگریزی نصاب سے متعلق مسائل پر غور و خوض کے لیے تمام پاکستانی یونیورسٹیوں اور ان کالجوں کے شعبۂ انگریزی کے صدر جہاں ایم اے انگریزی کی تعلیم دی جاتی ہے اسلام آباد کے ایک وفاقی ادارے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن میں جمع ہوئے تھے۔ دو تین دن تک میٹنگ جاری رہی۔ جہاں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے صدر پروفیسر ریاض حسن نے ان جلسوں میں اہم کردار ادا کیا وہاں اس شعبے کی ایک معلّمہ ڈاکٹر مس وانیا نے جو ڈاکٹر احسن فاروقی کی شاگردوں میں سے ہیں اُنھیں اس یونیورسٹی میں مدعو کیا۔ اس دعوت کے طفیل کوئی چار سال بعد ان سے میری ملاقات ہو سکی۔ اس وقت کیا خبر تھی کہ ان سے یہ آخری ملاقات ہو رہی ہے۔

جس دن ڈاکٹر مس وانیا نے فاروقی صاحب کو شعبۂ انگریزی میں مدعو

---

[1] ابھی یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں کہ سید آلِ رضا کی سنا ؤنی بھی آگئی۔ ن ۔ ص

کیا تھا اس سے ایک دن پہلے بھی چند لمحوں کے لیے مجھے ان سے ملنے کا موقع مل گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ملک بھر سے آئے ہوئے انگریزی کے پروفیسروں کی سرکاری ویگن صبح کے آٹھ نو بجے کے درمیان پروفیسر ریاض کو میٹنگ میں لے جانے کے لیے اوپن یونیورسٹی پہنچی۔ اس وقت حسنِ اتفاق سے پروفیسر ریاض یونیورسٹی کی کینٹین میں میرے ہی ساتھ چائے پی رہے تھے۔ جب انھیں ویگن کے آنے کی اطلاع ملی تو انھوں نے کہا۔ آپ کے فاروقی صاحب بھی ویگن میں ہوں گے۔ چنانچہ میں بھی ریاض صاحب کے ساتھ ویگن تک گیا۔ ریاض صاحب تو ویگن میں بیٹھ گئے۔ لیکن فاروقی صاحب مجھے دیکھ کر ایک شعر پڑھتے ہوئے ویگن سے اتر پڑے۔ میں نے اس شعر کے جواب میں کوئی فقرہ کہا۔ اس نوک جھونک سے نہ صرف فاروقی صاحب محظوظ ہوئے بلکہ ویگن میں بیٹھے ہوئے دوسرے پروفیسر صاحبان بھی۔ لیکن میرے حافظے پر خدا کی مار ہے کہ اس وقت نہ فاروقی صاحب کا شعر یاد آرہا ہے نہ اپنا جواب۔ بہرحال وہ مجھ سے ملے اور حسبِ معمول بڑے تپاک سے ملے۔

دوسرے دن جب وہ مس دانیا کی دعوت پر ہماری یونیورسٹی آئے تو تھوڑی دیر شعبۂ انگریزی میں بیٹھے اور تھوڑی دیر شعبۂ اردو میں۔ مس دانیا ان سے ایم اے انگریزی کے طلبہ اور طالبات کو ملانے کے لیے اس کمرے میں بھی لے گئیں جہاں ایم اے (انگریزی) کی کلاس ہوتی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر احسن فاروقی کا ایک خاص موضوع درس ملٹن تھا اس لیے مس دانیا نے ان سے درخواست کی کہ وہ ملٹن پر ایک مختصر لکچر دے دیں۔ فاروقی صاحب لکچر دینے کے موڈ میں نہ تھے اس لیے انھوں نے طلبہ اور طالبات کو ملٹن کے بارے میں سوالات کی دعوت دی۔ جو سوالات ان سے کیے گئے ان کا جواب وہ انگریزی اور اردو دونوں میں دیتے رہے۔

جو لوگ فاروقی صاحب سے ایک مرتبہ بھی مل چکے ہیں وہ جانتے ہیں

کہ فاروقی صاحب اپنی ساری علمیت اور شہرت کے باوجود ایک نہایت UNSOPHISTICATED آدمی تھے۔ ان کے ہر کام اور ان کی ہر بات میں ایک معصومیت اور معصومانہ مصلحت ناشناسی ہوتی تھی۔ ان کی یہ خصوصیت اُس دن بھی پورے طور پر ان کی شخصیت میں کارفرما تھی۔ طلبہ اور طالبات سے ملنے کے بعد وہ شعبۂ انگریزی اور شعبۂ اردو کے اساتذہ کے ساتھ دیر تک چائے پر گپ شپ کرتے رہے۔ ان سے گفتگو کرنے کے لیے خود گفتگو کرنا ضروری نہ تھا۔ بیچ بیچ میں کوئی بات پوچھ لینا کافی تھا۔ پھر ان کی ایک بات سے دوسری بات نکلتی چلی جاتی تھی۔ لیکن ان کی باتیں دل چسپ ہوا کرتی تھیں۔ اُنھوں نے کوئٹہ یونیورسٹی کے جو واقعات وحالات سنائے وہ بجائے خود دل چسپ تھے۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ کراچی سے قریب تر ہونے کے لیے بہاول پور کی یونیورسٹی میں آنے کے خواہش مند تھے لیکن کوئٹہ یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ فاروقی صاحب! اب آپ کا مزار یہیں بنے گا۔ مزار تو خیر نہ بن سکا لیکن اُنھوں نے وفات وہیں پائی۔

نیاز فتح پوری نے اردو ادب کو جو کچھ دیا اس میں ڈاکٹر احسن فاروقی بھی ہیں۔ اُنھیں کی ترغیب پر فاروقی صاحب نے اردو میں تنقیدی مضامین لکھنا شروع کیے۔ بُنیادی طور پر وہ انگریزی ادب کے آدمی تھے اور اُنھیں اعتراف تھا کہ اُنھیں اردو نہیں آتی تھی۔ نیاز صاحب ان کے مضامین کی لسانی اصلاح کرکے انھیں 'نگار' میں شائع کرتے تھے۔ بعض دُوسرے ایڈیٹر حضرات بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کی بعض عبارتوں میں بڑی ناہمواری یا کھردرا پن ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے بعض مضامین میں ان پر یہ اعتراض کیے بغیر نہ رہ سکا کہ لکھنوی ہونے کے باوجود اُنھیں اردو لکھنا نہیں آتی۔ جب زبان پر قدرت نہ ہو تو پھر تحریر میں منفرد اور دل کش اسلوب کہاں سے آئے۔ شاید یہ بھی ایک وجہ تھی کہ اُنھوں نے دُنیا کے کئی عظیم ناول نگاروں کے بڑے اسلوب ہونے پر زور دیا ہے۔ لیکن

جس طرح دُنیا کے بعض عظیم ناول نگار بے اسلوب ہونے کے باوجود عظیم ہیں اسی طرح فاروقی صاحب کی تحریریں لسانی کوتاہیوں کے باوجود زور اور اثر سے خالی نہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین مغربی ادب بالخصوص انگریزی ادب کے وسیع مطالعے اور بڑی حد تک اس کی قابلِ اعتماد تفہیم کی بنا پر ہمیشہ میری دل چسپی کا مرکز رہے۔ مجھے ان کے یہاں فراق گورکھپوری اور حسن عسکری کے سے FLASHES کبھی نظر نہیں آئے لیکن اُن کی باتوں میں وہ وزن اور ان کی رایوں میں وہ خود اعتمادی ضرور محسوس ہوتی رہی جو کسی علم یا فن کے صحیح ذوق اور ایک مخصوص اندازِ نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ مجھے ان کے بعض خیالات سے شدید اختلاف بھی رہا لیکن ان سے اختلافات کے باوجود ان کی تحریروں سے میری دل چسپی کبھی کم نہ ہو سکی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اردو کے ان دو تین نقادوں میں سے ہیں جو ناول اور افسانے پر رائے دینے کے زیادہ سے زیادہ اہل تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کو اپنے مطالعے کا کوئی خاص موضوع نہیں بنایا لیکن اُنھوں نے انیس کے مرثیوں پر یا اس سلسلے میں اردو مرثیے پر جو کچھ لکھا وہ فرقہ وارانہ عقیدت اور طرفدارانہ تعصب سے بلند تر ہو کر لکھا یعنی خود شیعہ ہونے کے باوجود اُنھوں نے اردو مرثیے کو شیعوں سے بچانے کی کوشش کی۔

میرے دل میں ڈاکٹر احسن فاروقی کا بڑا احترام تھا۔ اسی لیے جب میری پہلی کتاب "شہرت کی خاطر" شائع ہوئی تو قدرتی طور پر میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اس کتاب کے متعلق فاروقی صاحب کی رائے حاصل کی جائے۔ چنانچہ میں نے شاہد احمد دہلوی کو لکھا کہ اگر ممکن ہو تو 'ساقی' میں 'شہرت کی خاطر' پر فاروقی صاحب سے تبصرہ کرا دیجیے۔ شاہد صاحب نے مجھے کوئی اطلاع نہیں دی لیکن 'ساقی' میں میری کتاب پر جو تبصرہ شائع ہوا اس کے نیچے تبصرہ نگار کا نام ا۔ ف لکھا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ تبصرہ فاروقی صاحب ہی کا ہے۔ اس تبصرے میں ان کے بعض جانے پہچانے خیالات بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے ایک ملاقات

میں نے شاہد صاحب سے اپنے اندازے کی تصدیق چاہی لیکن وہ یہ کہہ کر ٹال گئے کہ تبصرہ نگار کا نام جاننا کیا ضرور۔

اگرچہ فاروقی صاحب کا تبصرہ کچھ زیادہ موافقانہ نہیں تھا پھر بھی جب میری دوسری کتاب 'تاثرات و تعصبات' شائع ہوئی تو میں نے تبصرے کے لیے 'سیپ' کے ایڈیٹر نسیم درانی کو لکھا کہ اس کتاب پر فاروقی صاحب سے تبصرہ کرادیں۔ جس زمانے میں ان کا تبصرہ چھپا میں مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات کی بنا پر کراچی آ چکا تھا اور اردو کالج کراچی سے منسلک ہو چکا تھا۔

غالباً ۱۹۷۰ء کے اوائل کی بات ہے۔ ایک دن نسیم درانی 'سیپ' کا شمارہ جس میں میری کتاب 'تاثرات و تعصبات' پر ڈاکٹر احسن فاروقی کا تبصرہ تھا مجھے اور کچھ دوسرے لوگوں کو دینے کے لیے اردو کالج آئے۔ مجھے پرچہ دیتے وقت اُنھوں نے بڑی معذرت آمیز گفتگو کی۔ کہنے لگے کہ اس میں آپ کی کتاب پر تبصرہ بھی ہے جو آپ ہی کی خواہش کے مطابق ڈاکٹر احسن فاروقی سے لکھوایا گیا ہے۔ میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ کر لیا کہ تبصرہ حسبِ معمول غیر موافقانہ ہوگا۔ بعد میں جب میں نے اسے پڑھا تو دیکھا کہ تین چار صفحے کے تبصرے میں کتاب کے متعلق تقریباً کچھ بھی نہیں کہا گیا تھا۔ البتہ اُنھوں نے اپنے اُن تعصبات کو بڑے شد و مد سے ظاہر کیا تھا جو اردو نقادوں کے بارے میں وہ سالہا سال سے ظاہر کرتے آرہے تھے۔ ممکن ہے اس تکرار اور شدت کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ زیرِ تبصرہ کتاب میں میرا ایک مضمون ہے 'کچھ اپنی صفائی میں'۔ اس میں مَیں نے اپنی کتاب 'شہرت کی خاطر' کے تبصرہ نگاروں کی غلط رایوں پر بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں فاروقی صاحب کے اعتراضات بھی میرے جواب کی زد میں آئے۔ اس سے پہلے بھی میں اپنے بعض مضامین میں ان پر سخت حملے کر چکا تھا۔ نتیجتاً 'تاثرات و تعصبات' پر تبصرے کے بہانے اُنھوں نے نہ صرف اردو کے دُوسرے نقادوں کو بلکہ مجھے بھی بزعم خود بُری طرح سنگسار کیا۔

"سیپ" کے متذکرہ پرچے کی اشاعت کے چند ہی روز بعد مشفق خواجہ کے دفتر (انجمن ترقی اردو پاکستان) میں ڈاکٹر احسن فاروقی سے میری پہلی ملاقات ہوئی جو خاصی ڈرامائی تھی۔ ہوا یہ کہ میں اردو کالج کی کلاسوں سے فارغ ہو کر حسبِ معمول مشفق خواجہ سے ملنے گیا۔ میں نے جب ان کے کمرے میں قدم رکھا تو دیکھا کہ ایک بزرگ ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ چونکہ ان کے کمرے میں ان سے ملنے والوں کی پشت دروازے کی طرف ہوتی تھی اس لیے جب تک آنے والا کرسیوں کے قریب نہ آجائے ان کے ملنے والوں کو پتا نہیں چلتا تھا کہ کون آرہا ہے۔ مشفق خواجہ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے سامنے بیٹھے بزرگ کی نظر بچا کر انھوں نے دونوں ہونٹوں پر انگشت شہادت رکھ کر مجھے بولنے سے منع کیا۔ چونکہ میں رسالوں میں بارہا فاروقی صاحب کی تصویریں دیکھ چکا تھا اس لیے میں تو انھیں تعارف کے بغیر پہچان گیا لیکن وہ مجھے نہ پہچان سکے۔ جب میں اُن کے قریب آکر کھڑا ہو گیا تو مشفق خواجہ نے ان سے کہا۔ ڈاکٹر صاحب! آپ انھیں پہچانتے ہیں؟ فاروقی صاحب نے مجھ پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ بھئی میں تو انھیں نہیں پہچان پارہا ہوں۔ اس پر مشفق خواجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ ہیں آپ کے "تازہ ترین شکار"...

نظیر صدیقی۔

میرا نام سُن کر قدرے حیرت اور قدرے خفت کے ساتھ انھوں نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا اور کہنے لگے کہ بھئی میں تو بار بار اعلان کر چکا ہوں کہ میں نقاد نہیں ہوں۔ صرف ناول نگار ہوں۔ میری تنقیدی تحریروں کو منسوخ سمجھا جائے۔ لیکن ایڈیٹر حضرات مانتے نہیں اور میرے پاس آکر نہ جانے مجھ سے کیا کچھ لکھوا لے جاتے ہیں۔ میں نے ان کی خفت کو دُور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر صاحب! چونکہ میں آپ کے چھوٹے نیازمندوں میں نہیں بڑے نیازمندوں میں سے ہوں اس لیے مجھے آپ کی ان تحریروں سے قطعی کوئی تکلیف نہیں پہنچتی جو میرے خلاف ہوتی ہیں۔ اگر میرے بارے میں آپ کی رائیں غیر موافقانہ

ہیں تو کوئی حرج نہیں البتہ اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ آپ کی غیر موافقانہ رائیں غیر جانبدارانہ ضرور رہیں۔

مشفق خواجہ، ڈاکٹر احسن فاروقی سے بہت بے تکلف تھے۔ وہ اُنھیں مختلف موضوعات پر چھیڑتے رہتے۔ اُس زمانے میں فاروقی صاحب سکھر کے کالج میں ملازم تھے۔ چھ سات ماہ بعد وہ وہاں کی ملازمت سے مستعفی ہو کر کراچی آ رہے۔ اس استعفا کے بعد ان پر بے روزگاری کا ایک طویل دور گزرا۔ کبھی کبھی ریڈیو پاکستان کے ادبی پروگراموں میں ہم دونوں اکٹھے ہو جاتے۔ ایک دن ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے ہمدرد جمیل جالبی نے ان کی مالی امداد کی صورت یہ نکالی ہے کہ وہ 'نیا دور' کے لیے کمیشن پر اپنے اُن شاگردوں سے اشتہارات لائیں جو بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ چنانچہ ایک عرصے تک انھوں نے یہ کام بھی کیا۔ تقدیر جو دکھائے سو ناچار دیکھنا۔ ان کے ایک شاگرد جمیل الرحمٰن حورانی جو ایم اے انگریزی میں ان کے طالب علم رہ چکے تھے اور سٹی کالج کے پرنسپل تھے، اُنھوں نے فاروقی صاحب کو کالج کا ایک کلاس روم شام کے وقت ایم اے انگلش کوچنگ سنٹر کے طور پر استعمال کرنے کی سہولت دے دی۔ آٹھ دس طلبہ اور طالبات وہاں ان سے انگریزی پڑھنے لگیں اور فاروقی صاحب کے لیے گزارے کی ایک صورت نکل آئی۔ میرا اندازہ ہے کہ سکھر کالج کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد کوئٹہ یونیورسٹی میں تقرر سے پہلے تک وہ معاشی طور پر خاصے پریشان رہے۔ ستمبر ۱۹۷۱ء میں میں اسلام آباد آ گیا تھا۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیان جب تک میں کراچی رہا ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ شخص جو اپنی تحریروں میں کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا ذاتی تعلقات میں حد درجہ خلیق اور شفیق ثابت ہوا۔ ان سے میرے تعلقات بڑھتے گئے۔ اس زمانے میں جب کبھی میں ان کے لیے کوئی موضوع تجویز کرتا وہ اسے قبول کر لیتے لیکن اس پر لکھنے کو یہ کہہ کر ملتوی کر دیتے کہ ذاتی حالات ٹھیک ہو

جائیں تو لکھوں۔

اسی زمانے میں ایک دن میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ اُنیسویں اور بیسویں صدی کے عظیم ناول نگاروں مثلاً ٹالسٹائی، دوستوفسکی، ٹومس مان، آندرے ژید، مارسل پروست، جیمس جوائس، کافکا اور ڈی ایچ لارنس وغیرہ پر مضامین کا ایک سلسلہ رسالہ 'صحیفہ' لاہور میں لکھیں تو اس سے اردو ادب کو بھی فائدہ پہنچے گا اور آپ کو بھی۔ اردو ادب کو ادبی فائدہ اور آپ کو مالی فائدہ۔ اس تجویز کی افادیت سے متفق ہونے کے باوجود اُنھوں نے اسے بھی آئندہ پر ٹال دیا۔

ناول کے معاملے میں بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک کے مغربی ناولوں پر ان کی گرفت بہت اچھی تھی۔ البتہ گزشتہ پچیس تیس سال کے دوران اُبھرنے والے ناول نگاروں سے اُنھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ان میں سے بعض بہت ممتاز ناول نگاروں کے نام تک ان کے لیے اجنبی تھے۔ میں نے انھیں ذہنی طور پر اس بات کے لیے بھی آمادہ کر لیا تھا کہ وہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے بعد کے ممتاز ترین مغربی ناول نگاروں سے اردو ادب کو روشناس کرائیں گے۔ لیکن کچھ تو اس لیے کہ ۱۹۷۰ء کے اواخر سے میرا ان کا ساتھ چھوٹ گیا اور کچھ اس لیے کہ پراگندہ روزی پراگندہ دل ساری تجویزیں اور سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

۱۹۷۰ء کے آخر یا ۱۹۷۱ء کے آغاز میں کراچی میں حلقۂ اربابِ ذوق کی تجدید ہوئی۔ میں برسوں پہلے ادبی انجمنوں کی سرگرمیوں سے دلچسپی کھو بیٹھا تھا۔ تاہم ضیا جالندھری اور سلیم احمد کی وجہ سے میں حلقے کے جلسوں میں شریک ہوتا رہا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ فاروقی صاحب ایک تند جبیں (HIGH-BROW) نقاد ہونے کے باوجود ان جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے۔ ان کی شرکت میں کسی کے پاس خاطر کو بھی دخل نہ تھا۔ وہ اپنی خوشی

سے آتے اور حلقے کی بحثوں میں دل چسپی کے ساتھ حصہ لیتے۔ ایک مرتبہ حلقے میں سلیم احمد نے اظہار و ابلاغ کے مسئلے پر یا یوں سمجھیے کہ موجودہ ادب میں ابہام کے مسئلے پر مضمون پڑھا۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے میرے خیالات و نظریات پر سخت نکتہ چینی کی۔ کراچی میں بعض لوگوں نے اس بات کو یوں پھیلا دیا کہ سلیم احمد اور نظیر صدیقی میں چل گئی۔ فاروقی صاحب اس جلسے میں شریک نہ تھے۔ کچھ عرصے تک میں بھی حلقے کے جلسوں میں شریک نہ ہو سکا۔ اس دوران میں ایک مرتبہ فاروقی صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا۔ کیسے آج کل حلقے میں جاتے ہیں۔ فاروقی صاحب کا جواب میرے لیے حیران کن تھا۔ کہنے لگے جس انجمن میں آپ کے ساتھ بدتمیزی ہوگی میں وہاں نہیں جا سکتا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں ہوئی اور میں زندگی بھر اس بات کی وکالت کرتا رہا ہوں کہ ذاتی تعلقات کے باوجود نقادوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے خیالات و نظریات کو سختی کے ساتھ پرکھیں۔

جس زمانے میں فاروقی صاحب سٹی کالج کراچی کے ایک کمرے میں ایم اے انگریزی کے طلبہ اور طالبات کو پڑھاتے تھے سٹی کالج کے پرنسپل جمیل حورانی نے اپنے بھائیوں کے اشتراک سے کئی کاروبار شروع کر رکھے تھے۔ ان میں سے ایک ان کا طباعتی ادارہ بھی تھا۔ اس کے لیے اُنھوں نے مجھ سے چار کتابوں اور فاروقی صاحب سے نہ جانے کتنی کتابوں کی طباعت کا معاہدہ کر لیا تھا۔ میری کتابیں تو چھ سال سے مخمصے میں پڑی ہوئی ہیں۔ البتہ اس دوران میں فاروقی صاحب کی دو کتابیں ——— ایک ان کا ناول 'سنگم' اور دوسرے ان کے افسانوں کا مجموعہ ——— شائع ہوئیں۔ افسانوں کا مجموعہ 'سنگم' سے بہتر چھپا ہے تاہم ان کی کوئی کتاب ان کے شایانِ شان کبھی نہیں چھپی۔ ناشروں نے انھیں ہمیشہ ستایا۔ دس دس سال تک ان کی کتابیں لیے بیٹھے رہے اور جب ان کی کتابیں شائع بھی ہوئیں تو معمولی کتابت اور کاغذ کے ساتھ۔ وہ لوگ جو اچھے پبلشر اور ایڈیٹر دونوں ہیں وہ ان کے مضامین کو مالی تجارت کے طور پر ضرور استعمال کرتے رہے لیکن اُنھیں کبھی توفیق نہ ہوئی کہ ان کی کوئی کتاب سلیقے کے ساتھ شائع کرتے۔

رسالوں میں ابھی تک ان کے نہایت عمدہ مضامین بکھرے پڑے ہیں۔ 'نقوش' میں مغربی ناول اور مغربی افسانوں پر ان کے بڑے اچھے طویل مضامین شائع ہوئے۔ اسی طرح 'نسائی' میں بیسیوں ادبی موضوعات پر ان کے چھوٹے چھوٹے مضامین چھپے۔ ایک مرتبہ میں نے انھیں ان مضامین کا مجموعہ چھپوانے کی ترغیب دی۔ وہ میرے مشورے کو بروئے کار لانے پر آمادہ ہو گئے لیکن ایک شرط رکھی۔ وہ یہ کہ میں ان مضامین کے مجموعے کا دیباچہ لکھوں۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ کسی احسن فاروقی کے تنقیدی مضامین کے مجموعے پر کسی نظیر صدیقی کے دیباچے کی ضرورت نہیں لیکن نہ مانے۔ آخر میں نے وعدہ کر لیا کہ دیباچہ لکھ دوں گا۔ اس زمانے میں ان کا ناول 'سنگم' زیر طبع تھا۔ لگے ہاتھوں انھوں نے مجھ سے یہ فرمائش بھی کر دی کہ میں 'سنگم' کا فلیپ بھی لکھ دوں لیکن فلیپ میں اس لیے نہ لکھ سکا کہ اسی زمانے میں مجھے کراچی سے اسلام آباد ہجرت کرنی پڑی اور دیباچہ لکھنے کی نوبت اس لیے نہ آئی کہ فاروقی صاحب اپنے تنقیدی مضامین کا مجوزہ مجموعہ مرتب نہ کر سکے۔

۱۹۷۳ء میں جب میں جمیل جورانی کے دفتر (کراچی) میں بیٹھ کر اپنی چار کتابوں کی کتابت کی تصحیح کر رہا تھا فاروقی صاحب ادھر سے گزرتے وقت مجھ سے ملنے آجاتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ فاروقی صاحب! آپ میری دو کتابوں کے فلیپ لکھ دیں۔ ایک تو 'شہرت کی خاطر' کے دوسرے ایڈیشن کا فلیپ۔ دوسرے میرے تنقیدی مضامین کے نئے مجموعے 'تفہیم و تعبیر' کا فلیپ۔ فاروقی صاحب نے اس باب میں ذرا بھی ٹال مٹول سے کام نہیں لیا۔ قلم کاغذ سنبھال کر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر میں دونوں فلیپ میرے حوالے کر دیئے۔ ان کا حافظہ قوی تھا اور ان کا علم حاضر۔ انھوں نے میری کتابوں کے فلیپ میری آرزو سے بھی بہتر لکھے۔ چونکہ میری دونوں متذکرہ کتابوں کی طباعت کھٹائی میں پڑی ہوئی ہے اور سردست مجھے اندازہ نہیں کہ وہ کب تک شائع ہو سکیں گی اس لیے ان دونوں کے فلیپ کو یہاں نقل کرنا بے جا نہ ہوگا۔ 'شہرت

کی خاطر' کا فلیپ یہ ہے :۔

' نظیر صدیقی وہ انشائیہ نگار ہیں جن کے انشائیوں کے مجموعے' شہرت کی خاطر' میں میں نے پہلی دفعہ اس صنف کے لیے جسے انگریزی میں پرسنل ایسے کہتے ہیں انشائیے کا لفظ استعمال ہوتا ہوا دیکھا۔ اسی لیے میں نے اس کتاب پر 'ساقی' میں ریویو کرتے ہوئے نظیر صدیقی کو انشائیے کا موجد قرار دیا۔ یہ بات کہ وہ اس صنف کے موجد ہیں یا نہیں بحث میں لائی جا سکتی ہے۔ مگر ان کے انشائیوں کا اردو ادب میں انگریزی صنف ایسے کے معیار پر پورا اترنا مسلم ہے۔ وہ اس صنف کے بہترین فن کاروں سے واقف ہیں اور ان پر قابلِ قدر رائیں دے چکے ہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک مخصوص ہیومر (HUMOUR) رکھتے ہیں جو ان کے انشائیوں کے طویل ہونے کے باوجود اپنا رنگ جمائے رہتا ہے۔ بہت سے جملے اپنی وِٹ کی وجہ سے حافظے پر ثبت ہو جاتے ہیں اور خاص خاص مواقع پر یاد آتے رہتے ہیں۔ اکثر ہی مزاحیہ کردار بڑے دلکش انداز میں نظر آتے ہیں اور یاد آنے اور ہنسانے رہتے ہیں۔ اکثر وہ بحثیں بھی لاتے ہیں جو لائٹ انداز کی وجہ سے گراں نہیں ہوتی۔ ان کی طنز زبردست کاٹ رکھتی ہے اور اس میں تلخی اور نفرت دونوں کا احساس ہوتا ہے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ نظیر صدیقی سے مجھے انشائیہ لکھنے کا وجدان حاصل ہوا۔'

میرے تنقیدی مضامین کے مجموعے 'تفہیم و تعبیر' کا فلیپ یہ ہے :۔

' میں نظیر صدیقی کو آج کے دو تین سب سے اہم نقادوں میں شمار کرتا ہوں۔ انھوں نے ادب کا وسیع علم حاصل کیا ہے۔ اردو ادب کے وہ منتہی ہیں مگر انگریزی ادب سے بھی ان کی واقفیت اردو کے دوسرے پروفیسروں سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ جدید ترین رجحانات سے برابر واقفیت حاصل کرتے رہتے ہیں اور ان کے سامنے میں نے اپنے کو اکثر آؤٹ آف ڈیٹ محسوس کیا۔ وہ ان نقادوں میں ہیں جن میں تنقیدی شعور کے ساتھ ساتھ تخلیقی قوت بھی ہے۔ سب سے پہلے

میرا ان سے تعارف ان کے انشائیوں کے ذریعے ہوا اور ان پر ساقی میں ریویو کرتے ہوئے میں نے یہ کہا کہ وہ اس صنف کے جدید موجد کہلائے جا سکتے ہیں۔ تنقید کے سلسلے میں وہ پروفیسر کلیم الدین احمد کی راہ کو آگے بڑھاتے نظر آتے ہیں۔ وہ تخلیق کار ول کو ان کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور محض پروفیسر نقاد کی طرح معلومات کا ڈھیر لگانے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ نہایت منکسر المزاج ہیں۔ اس لیے علم کے دروازے ان پر ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ ان کی تنقیدی رائیں نہایت صحیح ہوتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دعوت فکر دیتی ہیں اور ایک خاص قسم کی شگفتگی سے ہم کنار کرتی ہیں۔ عرصے تک وہ مشرقی پاکستان کی اردو تنقید میں سب سے زیادہ زور دار آواز رہے۔ اب وہ مغربی پاکستان آگئے ہیں اور راولپنڈی، لاہور اور کراچی کے ادبی حلقوں میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی تنقید میں اس وقت کے اور نقادوں کی تنقید سے زیادہ زندہ رہنے کی قوت ہے۔ ان کے مضامین جو بہترین ادبی رسائل میں چھپتے رہتے ہیں میں برابر پڑھتا ہوں اور نہ صرف لطف اندوز ہوتا ہوں بلکہ اپنا نقطۂ نظر بدلنے پر بھی تیار ہو جاتا ہوں۔ غالب کی فن کارانہ ہمہ گیری، اقبال کی شاعری میں انسان کا تصور اور اس کا مقام، جدید غزل، جدید شاعری کی جدید ترین شکلیں وہ مضامین ہیں جنھوں نے میرے علم اور بصیرت میں بڑا اہم اضافہ کیا اور ان کی طرف میں قارئین کی توجہ خاص طور پر مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ دوسرے مضامین میں بھی بہت سی ایسی باتیں ملیں گی جو اردو شاعری کو نئے زاویے سے دیکھنے میں مدد کریں گی۔ ایک خوش آئند اقدام، تعلیمی نظام میں ادب کے مقام پر ایسے خیالات دیتا ہے جو ادب کو سچی ترقی کی راہ پر لگانے والوں کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔ جدید ترین مصنفین کو درس میں شامل کرنے کی یہ تحریک مجھے بہت پسند ہے۔"

جب فاروقی صاحب نے مجھے یہ دونوں فلیپ لکھ کر دکھائے تو میں نے ان سے کہا۔ فاروقی صاحب! آپ میرے بارے میں کوئی بات محض اخلاقاً

نہ لکھیں اور اگر آپ نے ایسی کوئی بات لکھی ہے تو اب بھی کاٹ دیں۔ میرے بارے میں آپ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں انشائیے کا موجد ہوں۔ اس پر انھوں نے کہا میں نے آپ کے بارے میں کوئی بات اخلاقاً نہیں لکھی۔ جہاں تک انشائیے کے موجد ہونے کا تعلق ہے میرے لیے آپ ہی انشائیے کے موجد ہیں کیونکہ میں نے آپ کی شہرت کی خاطر سے پہلے انشائیے کی اصطلاح نہیں دیکھی تھی۔ میں نے تو آپ ہی کے انشائیوں سے INSPIRED ہو کر انشائیے لکھے ہیں جو رسالہ الشجاع (کراچی) میں شائع ہوتے رہے ہیں اور میں نے انشائیہ نگاری سے پہلے الشجاع میں انشائیے پر ایک مضمون بھی لکھا تھا جس میں میں نے اعتراف کیا ہے کہ یہ فن میں نے نظیر صدیقی سے سیکھا ہے۔ پھر کہنے لگے کہ میں آپ کی تنقید کا بھی اسی لیے قائل ہوں کہ آپ ادب کی ایک صنف یعنی انشائیے میں تخلیقی فن کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فاروقی صاحب کی اس رائے کا پس منظر ان کا یہ محبوب ترین نظریہ تھا کہ کسی فن پر تنقید کرنا صرف اس فن کے بہترین برتنے والوں کا حق ہے۔ یہ نظریہ انھوں نے بن جونسن سے لیا تھا۔ چونکہ اردو کے بیشتر نقاد خالی خولی نقاد ہیں یعنی وہ تخلیقی فن کار نہیں اس لیے فاروقی صاحب انھیں منشیانِ تنقید کہا کرتے تھے۔ اُن سے آخری ملاقات میں مجھ پر یہ بات بھی واضح ہوئی کہ انھوں نے 'منشیانِ تنقید' کی اصطلاح صرف اردو کے نقادوں کے لیے وضع نہیں کی تھی بلکہ وہ انگریزی ادب میں ڈاکٹر لیوس جیسے ممتاز ترین نقاد کو بھی 'منشیانِ تنقید' میں شمار کرتے تھے۔

فاروقی صاحب نے میری کتاب 'تفہیم و تعبیر' کے فلیپ میں جو باتیں لکھیں اُن میں دو باتوں پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ایک تو ان کے اس فراخ دلانہ اعتراف پر کہ ان کے مطالعے کے مقابلے میں میرا مطالعہ اپٹو ڈیٹ ہے۔ دوسرے اس بات پر کہ میں نے اپنے تنقیدی مضامین میں ادب کی تخلیق اور ادب کی تدریس کے باہمی تعلق پر جو زور دیا ہے وہ ان کی نظر میں تھا اور اسے انھوں

نے میرا ایک اہم CONTRIBUTION قرار دیا۔

نقاد کی حیثیت سے فاروقی صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے بڑے سے بڑے معاصرین پر بے لاگ انداز میں لکھنے کی جرأت رکھتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے ڈاکٹر عبدالحق، پروفیسر کلیم الدین احمد، نیاز فتح پوری، پروفیسر عبدالعلیم، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، عزیز احمد، پروفیسر احمد علی، حسن عسکری، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، خدیجہ مستور، شوکت صدیقی جیسے نقادوں اور ناول نگاروں پر قلم اُٹھایا اور ان کی کوتاہیوں کی نشاندہی میں کوئی رورعایت نہیں کی۔ وہ یقیناً اردو کے ان دو تین نقادوں میں سے ہیں جن کی بُت شکنی دوسروں کی بُت گری سے کہیں زیادہ مفید تھی۔

ان کی بہت سی تحریروں سے ان کی یہ آرزو جھلکتی اور جھانکتی رہی ہے کہ اُنھیں نقاد سے زیادہ ناول نگار کی حیثیت سے جانا پہچانا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو ناول کی تاریخ میں ان کی جگہ محفوظ ہے۔ ان کے ناول 'شام اودھ' کی اہمیت عام طور پر تسلیم کی جا چکی ہے۔ لکھنوی زندگی کے ایک خاص طبقے کے مصور کی حیثیت سے ان کے دوسرے ناول اور افسانے بھی دل چسپی سے پڑھے جائیں گے۔ یہ بات بھی نظر میں رکھنے کے قابل ہے کہ ان کی فسانوی تحریریں بڑی حد تک AUTOBIOGRAPHICAL ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ناولوں کے ہیرو بسا اوقات INTELLECTUAL معلوم ہوتے ہیں۔

ایک دن کراچی میں بسوں کی ہڑتال تھی۔ پھر بھی میں کالج جانے کے خیال سے گھر سے نکل پڑا۔ راستے میں اتفاقاً فاروقی صاحب بھی مل گئے۔ لیکن ہم دونوں کو ناظم آباد سے بندر روڈ جانے کے لیے کوئی سواری نہ مل سکی۔ ہم دونوں گپ شپ کرتے ہوئے پیدل ہی بندر روڈ پہنچ گئے۔ اس دن میرے ان کے درمیان موضوع گفتگو یہ تھا کہ کیا ایک عظیم فن کار کا ذہن ایک عظیم سائنس دان کے برابر ہوتا ہے بالفاظ دیگر کیا شیکسپیر، آئنسٹائن کے برابر ہے۔ یہ سوال میں نے ہی اُٹھایا تھا۔

فاروقی صاحب راستے بھر اس کا جواب دیتے رہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ایک عظیم فن کار ایک عظیم سائنس داں کے برابر ہوتا ہے۔

فاروقی صاحب خالی ہاتھ بہت کم چلتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی تھی جسے وہ بسوں میں بھی پڑھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ان کے ہاتھ میں موپساں کے افسانوں کا مجموعہ دیکھا تو کہا۔ فاروقی صاحب آپ اسے پہلے بھی پڑھ چکے ہوں گے، آج کل کیوں پڑھ رہے ہیں۔ کیا اس پر کچھ لکھنا ہے؟ کہنے لگے ۔ نہیں۔ لکھنا تو نہیں ہے لیکن جی چاہا کہ اسے پھر پڑھوں۔ اس لیے اسے چوتھی یا پانچویں مرتبہ پڑھ رہا ہوں۔

فاروقی صاحب جیسی شخصیتیں جب ہم سے بچھڑ جاتی ہیں تو ہم ان کا ماتم ضرور کرتے ہیں لیکن جب تک وہ ہمارے درمیان رہتی ہیں ہم صحیح معنوں میں ان کی قدر نہیں کرتے۔ ان کی صلاحیتوں سے نہ تو پورے طور پر فائدہ اُٹھاتے ہیں نہ انھیں فائدہ پہنچانے دیتے ہیں۔ نہ ہم ان کی کتابیں شائع کرتے ہیں نہ ان کی کارکردگی اور کارناموں پر کتاب لکھتے ہیں۔ ایسے لوگ ہزار طرح کی مصیبتیں اُٹھا کر زندہ رہتے ہیں اور سیکڑوں زحمتیں جھیل کر اپنی دو چار کتابیں شائع کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس صورتِ حال کے باوجود ہم یہ سوچنے یا پوچھنے سے باز نہیں آتے کہ آخر ہمارا ادب مغربی معیار تک کیوں نہیں پہنچتا۔ جس معاشرے میں مغربی شاہکاروں کو پڑھنے تک کی سہولتیں میسر نہ ہوں اس میں مغربی معیار تک پہنچنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔

دُنیا میں ہر آنے والا دُنیا سے جانے والوں کی قطار میں کھڑا ہوتا ہے گویا زندگی نام ہے موت کے انتظار کا۔ فاروقی صاحب کو اب موت کا انتظار نہیں رہا لیکن اردو ادب کو دُوسرے ڈاکٹر احسن فاروقی کا انتظار ضرور رہے گا۔

---

۴ مارچ ۱۹۷۸ء

جوشؔ ملیح آبادی

سال کون سا تھا یاد نہیں۔ غالباً سنہ ۱۹۵۶ء اور سنہ ۱۹۶۰ء کے درمیان کا واقعہ ہے۔ اپریل یا مئی کا مہینہ تھا۔ ڈھاکے کے ایک کالج میں سالانہ امتحانات ہو رہے تھے۔ انٹرمیڈیٹ کے اردو نصاب میں جوشؔ ملیح آبادی کی نظمیں بھی تھیں۔ میں نے امتحان کے پرچے میں جوشؔ کے متعلق بھی ایک سوال دے دیا تھا کہ جوشؔ ملیح آبادی کے حالاتِ زندگی لکھو اور ان کے کلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالو۔

جواب میں طلبہ نے جوشؔ کے حالات زندگی اور ان کے کلام پر وہ وہ روشنی ڈالی کہ پرچے دیکھتے وقت میری آنکھیں روشن اور میرے ہوش وحواس معطل ہو گئے۔ کسی نے لکھا۔ جوشؔ مشہور شاعر تھے لیکن بمبئی کی فلمی دنیا میں جاکر اپنی عزت گنوا بیٹھے۔ کسی نے لکھا۔ جوشؔ نظم کے بادشاہ تھے لیکن گیت لکھنے میں بھی بڑے ماہر تھے۔ اُن کا گیت "دیکھو دیکھو جوبنا کا ابھار" اردو کے مشہور و مقبول گیتوں میں سے ہے۔ کسی نے انکشاف کیا کہ جوشؔ، غالب کے شاگردوں میں سے تھے۔ کبھی کبھی شیفتہ سے بھی اصلاح لے لیا کرتے تھے۔ غدر کے بعد وفات پا گئے۔

اتفاق دیکھئے کہ اس امتحان کے دو تین ماہ بعد ۱۴ اگست کے مشاعرے میں مغربی پاکستان سے جو شعرا ڈھاکے مدعو کیے گئے ان میں پہلی مرتبہ جوشؔ بھی

بلائے گئے۔ شہر میں مشاعرے کے پوسٹر لگے تو میں نے اپنے طلبہ سے کہا ۔ نالائقو! تم نے جس جوشؔ کو اپنی جہالت کی تلوار سے قتل کر کے مرحومین کی فہرست میں ڈال دیا ہے وہ پہلی مرتبہ ڈھاکے آرہے ہیں ۔ انھیں دیکھنے اور سُننے کے لیے مشاعرے میں ضرور جانا۔

جوشؔ کو دیکھنے اور سُننے کی آرزو میری دیرینہ آرزوؤں میں سے تھی لیکن جب جوشؔ مشاعرے میں شرکت کے لیے ڈھاکے آئے تو میں اپنی ناگہانی علالت کے باعث جوشؔ کو نہ دیکھ سکا نہ سن سکا۔ لیکن اسے میری خوش نصیبی کہیے کہ ایک مرتبہ مدعو ہونے کے بعد جوشؔ ڈھاکے کے مشاعروں میں اکثر مدعو ہوتے رہے۔ جب دوسری مرتبہ آئے تو مجھے ان سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یاد نہیں کہ ان سے میرا تعارف کس نے کرایا۔ ممکن ہے ڈاکٹر عندلیبؔ شادانی نے تعارف کرایا ہو۔ دوسری مرتبہ جوشؔ ڈھاکے آئے تو ان کی ثقافتی مصروفیتیں بہت تھیں۔ ڈھاکے کی متعدد ادبی اور ثقافتی انجمنوں نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ ایک بنگالی انجمن نے بھی انھیں اپنے یہاں مدعو کیا جس میں ان سے خواہش کی گئی کہ وہ ٹیگور کے ساتھ اپنے روابط پر کچھ روشنی ڈالیں۔ جوشؔ نے ٹیگور کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں چند باتیں بتائیں۔ ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں جب ٹیگور لکھنؤ گئے تو مسز سروجنی نائڈو نے ٹیگور سے جوشؔ کا تعارف کرایا۔ ٹیگور نے جوشؔ کو شانتی نکیتن آنے کی دعوت دی۔ جوشؔ نے یہ دعوت قبول کی اور تقریباً چھ مہینے شانتی نکیتن ہی رہے۔ ٹیگور اور جوشؔ میں قدرِ مشترک تصوف کا ذوق تھا۔ اس زمانے میں جوشؔ بھی متصوفانہ میلان رکھتے تھے —— اس جلسے میں ایک مشہور بنگالی صحافی چودھری ظہور نے جوشؔ کی تشریف آوری پر انتہائی مسرت اور فخر کا اظہار کیا۔

۱۹۶۱ء میں جب وہ میری کتاب "شہرت کی خاطر" کی طباعت کے بعد ڈھاکے آئے تو قدرتی طور پر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اپنی کتاب

ان کی نذر کروں اور اس کے بارے میں ان کی رائے حاصل کروں۔ انھیں کتاب نذر کرنا جتنا آسان تھا اس کے بارے میں ان کی رائے کا حصول اتنا ہی دشوار تھا۔ ان کے گرد جو ہجوم رہا کرتا تھا اس کے پیشِ نظر مجھے اس کا بھی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ میری نذر کردہ کتاب ان کے ساتھ ڈھاکے سے کراچی بھی پہنچ سکے گی۔ پھر ان کی مصروفیات اور از خود رفتگی کے پیشِ نظر اس کی بھی امید نہ تھی کہ وہ میرے ایسے ایک نوخیز مصنف کی کتاب پڑھ کر اس پر کچھ لکھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ جلسوں، مشاعروں اور نشستوں میں کئی ملاقاتوں کے باوجود ملاقاتوں نے مراسم کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ اس لیے میں نے اپنی کتاب خود ان کی خدمت میں پیش کرنے کی بجائے اپنے ایک دوست کے ذریعے جنھیں ان کی خدمت میں تقرب حاصل تھا، بھیجی اور یہ خواہش کی کہ وہ پوری کتاب پڑھنے کی بجائے صرف چار پانچ مضامین جن پر میں نے نشان لگا دیئے تھے پڑھ کر اپنی رائے لکھ بھیجیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور مجھے ان کی رائے پا کر نہ صرف یہ خوشی ہوئی کہ اردو کے ایک ممتاز ترین شاعر نے میری کتاب پر رائے لکھی بلکہ یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی کہ اُنھوں نے مجھے رسمی رائے سے نہیں نوازا بلکہ صرف چند مضامین پڑھ کر پیشہ ور نقاد نہ ہونے کے باوجود میرے طنزیہ مضامین کی رُوح تک پہنچ گئے اور اپنی مختصر سی رائے میں کتاب کی ان بُنیادی اور امتیازی خصوصیات کی نشاندہی کر گئے جن کی نشان دہی میری آرزو کے عین مطابق تھی۔ جوشؔ سے پہلے مجھے اپنی اس کتاب کے بارے میں پروفیسر کنہیا لال کپور کی نہایت پُرجوش رائے مل چکی تھی۔ لیکن جو گہرائی اور جامعیت جوشؔ کی رائے میں تھی وہ آج تک اس کتاب سے متعلق کسی اور کی رائے میں نظر نہ آئی۔ اُنھوں نے لکھا تھا:۔

"صاحب کتاب کی ذات میں وہ نادر جوہر جگمگا رہا ہے جو مسائل سنج و حیات آگاہ ادیبوں کے علاوہ اور کسی میں نہیں پایا جاتا اور جس کے عطا کرنے میں قدرت نہایت بخیل واقع ہوئی ہے۔ اسی کے رونق بدوش ان کے طرزِ نگارش سے اس

اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ ان میں وہ ابلاغی توانائی بھی کارفرما ہے جو اعلیٰ مصنفوں کے دماغ کی آتشِ خلاقی کو قارئین کے دورانِ خون میں آسانی سے منتقل کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں وہ مفکرانہ ژرف نگاہی بھی پائی جاتی ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو ادب محض ایک شعلہ سرد و ضیائے بے حرارت بن کر رہ جاتا ہے۔"

'شہرت کی خاطر' کی طباعت کے ڈیڑھ سال بعد میری دوسری کتاب 'تاثرات و تعصبات' (جو میرے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے) منظرِ عام پر آ گئی۔ میں نے اس کی ایک جلد جوشؔ کے پاس کراچی بھیجی اور اس کے بارے میں ان کی رائے کے لیے کئی خط لکھے۔ وہ اپنے وعدوں کے باوجود رائے نہ بھیج سکے۔ ڈھاکے کے ایک مشاعرے میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے آخری تقاضے کے طور پر ان سے رائے بھیجنے کی درخواست کی۔ کہنے لگے ـــ آپ کا کام اس قابل ہے کہ اس کی تعریف کی جائے اور اس پر لکھا جائے لیکن آپ کو اندازہ نہیں کہ کراچی میں میری زندگی کس عذاب سے دوچار رہتی ہے۔ دفتری مصروفیتیں (اس زمانے میں جوشؔ ترقی اردو بورڈ میں ملازم تھے) اور دوسری در دسری اتنی رہتی ہے کہ کچھ کر نہیں پاتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس معذرت کے بعد میں نے ان سے رائے کے لیے مزید تقاضا مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ دوسری کتاب کے متعلق مجھے ان کی تحریری رائے کبھی حاصل نہ ہو سکی اور میں نے اپنی تیسری کتاب 'میرے خیال میں' (جو ۱۹۶۸ء میں چھپی) ان کے پاس بھیجنا بے سود سمجھا۔

لیکن جوشؔ نے 'تاثرات و تعصبات' کے بارے میں جو زبانی رائے ظاہر کی اس نے مجھے ان کے قریب آنے میں میری حوصلہ افزائی کی اور ایک سال (یاد نہیں وہ سال کون سا تھا) ڈھاکے میں ان کے ساتھ آٹھ روزہ قیام نے مجھے ان کے قریب آنے کے مواقع بھی فراہم کر دیئے۔ جوشؔ ڈھاکے کے مشاعرے میں آئے تو ڈھاکے سے دور نارائن گنج میں رام پور کے ایک صاحبِ ثروت تاجر سلامت علی خاں کے یہاں ٹھہرائے گئے۔ بڑے مشاعرے کے بعد متعدد چھوٹے مشاعرے

اور نشستیں ہوتی رہیں۔ ایک شام جب وہ ڈھاکے کی ایک ادبی انجمن کے دیئے ہوئے استقبالیے سے فارغ ہوئے تو کچھ لوگ ڈھاکے سے ان کی بزم شام میں شریک ہونے کے لیے ان کے ساتھ ہو لیے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ آفتاب غروب ہوا اور جوش طلوع ہوئے۔ خیال آتا ہے کہ وہ زمانہ رمضان کا تھا۔ استاد قمر جلالوی بھی کراچی سے مشاعرے میں آئے ہوئے تھے۔ اگرچہ ٹھہرائے کہیں اور گئے تھے لیکن اس شام وہ بھی جوش کے ہم نشینوں میں تھے۔ جوش کے میزبان سلامت علی جوش کے اعزاز میں بادہ و جام کا اہتمام اس دریا دلی سے کرتے کہ شرکائے محفل میں جو چاہے اپنے صاحبِ ذوق ہونے کا ثبوت دے لے۔ بزم ناؤ نوش کا آغاز ہوا۔ رندانہ گفتگو اور زندہ دلانہ قہقہے شروع ہوئے۔ جوش نے استاد قمر سے اصرار کرنا شروع کیا کہ آج وہ بھی اپنی توبہ توڑ ہی ڈالیں۔ وہ ہنس ہنس کے معذرت کرتے رہے۔ پھر طے پایا کہ جو شعرا موجود ہیں وہ اپنا کلام سنائیں۔ جب میری باری آئی تو میں نے اپنی یہ غزل شروع کی ۔

یہ جو انساں خدا کا ہے شہکار
اس کی قسمت پہ ہے خدا کی مار

جوش اور استاد قمر دونوں پر سرخوشی غالب آ چکی تھی۔ دونوں نے اپنی بدیہہ گوئی سے اس غزل کی ریڑھ مار دی۔ میرے ہر شعر پر دو چار فحش شعر کہتے چلے گئے۔ جب جوش کی باری آئی تو ان سے فرمائش کی گئی کہ وہ فحشیات سنائیں۔ چنانچہ انھوں نے دو تین ایسی غزلیں سنا ڈالیں جن کا شجرۂ نسب رفیع احمد خاں کی شاعرانہ روایات سے ملتا ہے۔ غالباً اب اس بات سے کوئی ناواقف نہیں کہ رفیع احمد خاں مرحوم فحشیات کے بے مثال شاعر تھے۔ شوکت تھانوی سے رفیع احمد خاں کے چند اشعار سن کر علامہ اقبال نے نے کہا تھا کہ اگر یہ شخص سنجیدہ شاعری کی طرف مڑ جاتا تو بڑے بڑوں کے چراغ گل ہو

جاتے۔ جوشؔ کو جو رفیع احمد خاں کے دوستوں میں سے ہیں ان کا بہت سا کلام یاد ہے۔ وہ اپنی فحشیات کے ساتھ ساتھ ان کی فحشیات بھی از راہ تعریف سناتے ہیں۔ جوشؔ نے اپنے مخصوص اسلوب میں نہ صرف فحش غزلیں کہی ہیں بلکہ نظمیں بھی۔ ان غزلوں اور نظموں میں بھی ان کے طرزِ بیان کی شوکت اور تشبیہات و استعارات کی جدت داد کے قابل ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں جوشؔ کی ایک بے تکلف صحبت میں شریک ہوا اور چونکہ اس دفعہ جوشؔ کئی روز اپنے میزبان کے ہاں ٹھہرے مجھے ان کی مزید بے تکلف صحبتوں میں شریک ہونے کے مواقع ملے۔ جوشؔ اپنے سامنے گھڑی رکھ کر مقررہ وقت پر مقررہ وقفے کے اندر مقررہ مقدار میں شراب پیتے ہیں۔ وہ اپنی شراب نوشی کا وقت کسی کی خاطر ضائع نہیں کر سکتے۔ ایک مرتبہ ڈھاکے میں گورنر اعظم نے مغربی پاکستان سے آئے ہوئے چند شاعروں کو غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے اپنے ہاں مدعو کر لیا۔ جوشؔ بھی لے جائے گئے۔ لیکن وہ کچھ ہی دیر میں اپنی قیام گاہ کو واپس چلے گئے۔ گورنر اعظم کو معلوم ہوا کہ جوشؔ واپس چلے گئے تو انھوں نے کسی سے ان کی واپسی کا سبب پوچھا۔ بتایا گیا کہ یہ ان کے پینے کا وقت ہے۔ اس پر گورنر نے کہا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ ان کے پینے کا وقت ہے تو اس کا انتظام یہیں ہو جاتا۔

جوشؔ باقاعدہ نوش ضرور ہیں۔ بلا نوش ہرگز نہیں۔ اس لیے شراب پی کر ان کے بہکنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ لیکن وہ بہ ثبات ہوش و حواس اپنی بزم ناؤ نوش میں جتنے عریاں الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہیں۔ ان کی گفتگو کے مقابلے میں ان کی کتاب 'یادوں کی برات' کچھ بھی نہیں ہے۔ ان کی گفتگو کے پیشِ نظر غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قدرت نے جوشؔ سے زیادہ بے جھجک انسان پیدا نہیں کیا۔ نہ صرف بے جھجک بلکہ غیر محتاط بھی۔ ان کی بے تکلف صحبتوں میں شریک ہونے کے لیے ان کا یارِ غار اور راز دار ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی بزم شام میں سوچتے ہی نہیں کہ اس بزم میں نئے آنے والے ان کی ممتاز و محترم اور پُر وقار شخصیت کے بارے میں

کیا کیا عقیدت مندانہ تصورات سے کرآتے ہیں یا یہ کہ ان عقیدت مندوں میں کوئی کسی قسم کا جاسوس بھی ہو سکتا ہے جو ان کی رندانہ گفتگو کو مجرمانہ گفتگو کا رنگ دے سکتا ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ان کے یہاں بے اعتدالی بادہ نوشی میں نہیں صاف گوئی میں ہے اور بے احتیاطی ان کے یہاں صرف لغزش نہیں بلکہ عین خطرت ہے۔

اگر ان کی بادہ نوشی کے دوران ان سے کچھ سنانے کی فرمائش کی جائے تو وہ اپنے رومانی کلام کو اپنے فکری کلام پر ترجیح دیتے ہیں لیکن شغل مے و مینا کے دوران میں بھی وہ رندانہ گفتگو کے ساتھ ساتھ حکیمانہ گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں مسخرگی اور سنجیدگی یا بالفاظ دیگر تمسخر و تفکر کے عناصر اس انداز سے سموئے ہوئے ہیں کہ وہ بیک وقت نہایت ہلکی پھلکی گفتگو بھی کر سکتے ہیں اور نہایت سنجیدہ گفتگو بھی۔ انھیں جنس اور مذہب دونوں سے یکساں دلچسپی رہی ہے۔ ان کی زندگی نے انھیں عیش کوشی اور لذت اندوزی کے بڑے مواقع عطا کیے ہیں لیکن وہ اپنی ساری عیش کوشی اور لذت اندوزی کے باوجود یہ کبھی نہیں بھول پاتے کہ زندگی ایک کربناک حقیقت ہے اور مذہب اس حقیقت کی کربناکی کا کوئی معقول جواز پیش نہیں کر سکتا۔ ان کی جنسی دلچسپیوں نے ان کو ایک سدابہار رومانی اور حیات و کائنات کی کربناکی نے انھیں ملحد بنا دیا ہے۔ چونکہ وہ ہر سال محرم میں مرثیہ بھی کہتے ہیں اس لیے بہتوں کے نزدیک ان کا الحاد ایک مشکوک حقیقت ہے۔ میں نے حال میں ان کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ ان کی مرثیہ گوئی ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں غلط فہمیوں کا باعث ہے تو کہنے لگے ___ میرے مرثیوں میں بین نہیں ہوتا۔ میرے مرثیوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگ کسی حوالے سے صحیح راستے پر آ ئیں۔ حضرت علیؓ کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ایک صاحبِ نظر تھے۔ لیکن اُن کے بڑے بھائی یعنی آں حضرت نے اُنھیں فکر و بصیرت کی راہ پر چلنے نہیں دیا۔ سیفی نوگانوی (عمر ۸۳ سال) جن کا شمار دُنیا کے ملاحدۂ اعظم میں ہونا چاہیے اُنھوں نے حال میں اپنی دو کتابیں جوش کے پاس بھیجیں جن میں سے ایک، قرآن پر تنقید ہے اور دوسری

نہج البلاغہ پر۔ جوش نے ان دونوں کتابوں کا ازراہِ تعریف مجھ سے ذکر کیا مجھے وہ ان تصانیف سے خوش نظر آئے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اُنھوں نے حمد، نعت، منقبت اور مرثیہ سبھی کچھ کہہ رکھا ہے لیکن مجھے اس میں شک نہیں کہ بنیادی طور پر ان کے خیالات وجذبات ملحدانہ ہیں ۔

رہِ کُفر کی خاک چھاننے گا جوش
نہ مانا ہے تجھ کو نہ ماننے گا جوش

اگر الحاد نام ہے مذہب کے دیئے ہوئے تصورِ خدا پر ایمان نہ لانے کا تو جوش یقیناً کسی مذہب کے خدا کے قائل نہیں کیونکہ حیات وکائنات کے حقائق اس خدا کے صفات کی تصدیق نہیں کرتے جس کی تصویر یا جس کا تصور کسی مذہب میں ملتا ہے البتہ وہ اس بات کے قائل ضرور رہیں کہ کوئی توانائی ہے جس نے یہ کائنات پیدا کی ہے اور اس توانائی کی حقیقت اور ماہیت ابھی تک انسانی علم کی رسائی سے بالاتر ہے۔

جس زمانے میں جوش سلامت علی کے یہاں چھ سات روز مہمان رہے سلامت علی کے یہاں ان کے بڑے بڑے عقیدت مند پیدا ہو گئے جن میں سے کوئی ان کا بیگ اُٹھائے پھرتا اور کوئی ان کو دُنیا کا سب سے بڑا شاعر منوانے پر مصر رہتا۔ اپنی زندگی کے رنگین ابواب کے بیان میں جوش کی بے تکلفی بلکہ بے باکی اور بے حجابی سے بعض نے یہ انسپیریشن لیا کہ اپنی اغلام بازی تک سے متعلق واقعات ان لوگوں کو بھی سنانے لگے جن سے راز داری تو ایک طرف دوستی تک نہ تھی غرض کہ اس زمانے میں جوش ڈھاکے کے متعدد حضرات کے لیے چھوت کا مرض بن گئے تھے۔ ان کی صحبتوں میں ہر قسم کی سنجیدہ اور غیر سنجیدہ گفتگو ہوتی رہتی۔ میں اس گفتگو کو علمی اور منطقی سطح پر لانے اور رکھنے کی کوشش کرتا رہتا۔ جوش فلسفیانہ

موضوعات پر سنجیدہ گفتگو کرتے کرتے کوئی تمسخر آمیز فقرہ کہہ جاتے۔ ایک مرتبہ گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ فطرت نے انسان کو جسمانی اعتبار سے کتنا کثیف بنایا ہے۔ شاید میں نے اس موقع پر یہ رباعی سنائی ؎

ہے روح بشر نغمہ و نکہت بہ کنار
اور طبع بشر حسن و لطافت پہ نثار
بخشا اسی انساں کو مگر جسم کثیف
اس ذوقِ خدا پر ہو خدا ہی کی مار

اس پر جوشؔ نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے غیر سنجیدہ الفاظ میں جو کچھ کہا اسے زیادہ سے زیادہ مہذب الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ فطرت واقعی اس قدر بدمذاق ہے کہ صبح کے وقت جو وقت کا بہترین حصہ ہوتا ہے انسان کو سب سے پہلے باتھ روم جانے پر مجبور کرتی ہے۔ پھر اس موضوع پر مزید گفتگو ہوتی رہی جسے ہربرٹ ریڈ نے انسان کی جسمانی INDIGNITIES سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں میں اس گفتگو کی تفصیل کو قلم انداز کر رہا ہوں۔ ممکن ہے بعض طبیعتیں صرف اس موضوعات سے منغص ہو رہی ہوں۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ چرکین کی بول و براز والی شاعری ہو یار فیع احمد خاں کی جنسیاتی شاعری یا جوشؔ کی محفل میں ممنوعہ موضوعات سے متعلق گفتگو یہ سب قدرت کی بدمذاقی اور انسان کی بدبختی کے ناگریز پہلو ہیں۔ شرافت، شائستگی اور تہذیب کے نام پر انسان نے ان موضوعات کو اپنے اوپر حرام تو کر لیا ہے لیکن ان موضوعات پر اس کے دل و دماغ کچھ سوچے اور کہے بغیر رہ بھی نہیں پاتے۔ فلسفۂ وجودیت نے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ انسان کیڑہ ہے یا خدا۔ اگر یہ کیڑہ خدا بھی بن جائے جب بھی اس میں کیا شبہ کہ وہ اپنی شخصیت کے بعض مضحکہ خیز اور کراہت انگیز خصوصیات سے نجات نہیں پا سکتا۔ فکری

اور عملی اکتسابات اور امکانات کے اعتبار سے انسان کا جس قدر پُر وقار تصور ذہن میں پیدا ہوتا ہے جسمانی اور جنسی ضرورتوں کے اعتبار سے وہ اتنا ہی پست اور مضحکہ خیز مخلوق معلوم ہوتا ہے۔

جوشؔ کی ایک خصوصیت لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ زبان کی غلطی کی تاب نہیں لاتے خواہ وہ غلطی کسی سے سرزد ہو رہی ہو۔ مشہور ہے کہ وہ مولانا ابوالکلام آزادؔ جیسے عالم تک کو ٹوک چکے ہیں۔ ان کی طبیعت کے اس پہلو کو دیکھنے کا اتفاق مجھے بھی ہوا ہے بلکہ اوروں کے ساتھ میں خود بھی ان کے اعتراضات کی زد میں آتا رہا ہوں۔

۱۹۶۹ء کے اواخر میں مشرقی پاکستان میں سیاسی زلزلوں کے آثار دیکھ کر میں کراچی آگیا جہاں میں اردو کالج سے وابستہ رہا۔ کالج کے طلبہ ایک مشاعرے میں جوشؔ کو کھینچ لائے۔ مشاعرے میں جوشؔ سے صاحب سلامت ہوئی لیکن اس طرح جیسے کہ وہ مجھے نہیں پہچانتے۔

ایک مرتبہ پروفیسر وقار عظیم لاہور سے کراچی تشریف لائے اور اپنی قیام گاہ پر انھوں نے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں کراچی کے بیشتر ممتاز شعرا مدعو تھے۔ شرکا میں جوشؔ، فیضؔ اور زیڈ اے بخاری بھی تھے۔ جس وقت جوشؔ آئے سب لوگوں نے کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کیا۔ جب وہ مجھ سے مصافحہ کرنے لگے تو میں نے کہا۔ مجھے پہچان بھی رہے ہیں یا نہیں۔ فرمایا۔ پہچانتا ہوں مگر شکایتوں کے ساتھ۔

شکایتیں بجا تھیں۔ میں کراچی میں سکونت پذیر ہونے کے باوجود ان سے ان کے گھر پر نہیں ملا۔ جانے آنے کی دشواریاں سنگ راہ تھیں۔ بہرحال ایک مرتبہ شام کے وقت ان کے محلے سے گزرنے کا اتفاق ہوا سوچا ان سے ملتا چلوں۔ تھوڑی سی جستجو کے بعد ان کا مکان مل گیا۔ نچلے حصے میں تاریکی اور خاموشی تھی مجھے اوپر لے جایا گیا۔ دیکھا کہ جوشؔ کا بستر اور ان کے لکھنے کی میز کسی کمرے کی بجائے

برآمدے میں ہے۔ وہ اپنی چوکی پر بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ سامنے بھنی ہوئی دال رکھی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے ازراہ تواضع دال میرے سامنے بڑھا دی۔ میں نے تھوڑی سی دال پھانک لی۔ کچھ گفتگو کی لیکن محسوس ہوا کہ جوش گفتگو میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں جیسے کہ ذہن ماؤف ہے یا کہیں اور ہے۔ میں نے دس منٹ کے اندر ان سے اجازت چاہی اور اجازت لے کر جہاں جانا تھا وہاں چلا گیا۔ ان کے گھر کے بجھے بجھے ماحول اور بادہ کشی کے باوجود ان کی بجھی بجھی طبیعت کو دیکھ کر ان پر ترس آیا۔ لیکن کر کیا سکتا تھا۔

ستمبر ۱۹۷۱ء میں میرا آب و دانہ مجھے کراچی سے اسلام آباد لے آیا۔ ۱۹۷۲ء میں جوش بھی وزارت اطلاعات سے منسلک ہو کر یہاں آ گئے۔ پنڈی کے ریلوے انسٹی ٹیوٹ میں ان کے قدر دانوں نے اُنھیں استقبالیہ دیا۔ بہت بڑا اجتماع تھا۔ ہجوم میں ایک جگہ مجھ سے بھی ملاقات ہو گئی کہنے لگے آپ تو کراچی میں ہوتے ہیں۔ میں نے کہا۔ اب مشرف بہ اسلام آباد ہو گیا ہوں۔ کہنے لگے اچھا تو اب اسلام آباد میں بڑے بڑے کُفر جمع ہو گئے ہیں۔

۱۹۷۳ء کے آخر میں ان سے پہلی مرتبہ ان کی قیام گاہ پر ملا۔ جب ان سے رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ فرمایا 'بس بھئی آتے رہو۔ بڑی تنہائی ہے'۔ اس تنہائی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کا قیام اسلام آباد کے ایک بعید ترین علاقے میں ہے جہاں ذاتی سواری کے بغیر جانا آنا ممکن نہیں۔ بہرحال جب کبھی کسی دوست کے ذریعے کسی سواری کا انتظام ہو جاتا ہے تو ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ملاقات عموماً شام ہی کے وقت ہوتی ہے کیونکہ دن کے وقت وہ کام اور آرام میں مصروف ہوتے ہیں۔ شام ان کے لیے صرف دن کا اختتام نہیں بلکہ ایک نئی اور شگفتہ زندگی کا آغاز بھی ہوتی ہے۔ بادہ و جام جیسے محبوب مشغلے کو اُنھوں نے شام ہی کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ بقول ان کے سے

دن کو پینا حرام ہے پیارے
رات کو لطفِ جام ہے پیارے

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا شام کے وقت جب ان سے تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی جاتی ہے تو وہ اپنے رومانی کلام کو فکری کلام پر ترجیح دیتے ہیں لیکن اپنے رندانہ مشغلے کے دوران سرور و سرمستی کے باوجود فکری اور فلسفیانہ گفتگو نہ صرف گوارا کر لیتے ہیں بلکہ اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ یہاں فکری اور فلسفیانہ گفتگو کی تحدید ضروری ہے۔ ان کی فکری دلچسپی کا محور انسان کی فطرت اور قسمت ہے۔ اس بارے میں ان کے خیالات و نظریات چونکہ مذہب کے منافی ہیں اس لیے جب انسان کی فطرت و قسمت پر گفتگو ہوتی ہے تو مذہبی عقائد اور تصورات لازمی طور پر زد میں آتے ہیں۔ وہ اپنے غیر مذہبی اندازِ فکر کو کسی سے چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کی صحبت میں بیٹھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی غیر مذہب پرستانہ گفتگو کی تاب لا سکے۔ انسانی زندگی کے ایک زبردست المیہ ہونے کا جیسا الم ناک احساس ان کے اندر ہے ویسا اب تک مجھے کسی اور کے یہاں نہیں ملا۔ وہ انسان کو نہ صرف ترحم کی نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ تنفر کی نظر سے بھی۔ انسان پر انسان کے مظالم یا انسان کے ساتھ انسان کی بربریت کا ذکر آتا ہے تو کہتے ہیں کہ اگر انسان کو سور کہا جائے تو سور ازالۂ حیثیت عرفی کا دعوی کر دے گا۔ ان کے یہاں انسان کے ظالم اور مظلوم ہونے کا احساس یکساں شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ انسان سے بیزار اور اس کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسانی ارتقا کی رفتار حد درجہ سست سہی پھر بھی اس کا مستقبل بے حد شاندار ہے۔ اُنھیں کا شعر ہے ؎

کہہ دو ں تو فتوے کفر کے مجھ پر لگائے خلق
وہ ارتقائے نوعِ بشر دیکھتا ہوں میں

ان کا خیال ہے کہ جب انسانی شعور سنِ بلوغ کو پہنچ جائے گا تو خیر و شر کا معیار صرف یہ ہوگا کہ جو چیز انسانی زندگی کو آرام دہ اور خوش گوار بنائے وہ خیر ہے اور جو چیز دوسروں کو تکلیف اور نقصان پہنچائے وہ شر ہے۔ انسانی اقدار سے متعلق باقی ساری بحثیں بکواس قرار پائیں گی۔ میں نے انھیں حافظ کا یہ مصرعہ یاد دلایا کہ ؎ مباش در پئے آزار و ہرچہ خواہی کن تو انھوں نے کہا۔ یہی خیال میرا بھی ہے۔ وہ انسانی زندگی پر کم سے کم پابندیاں دیکھنا چاہتے ہیں خواہ وہ پابندیاں تہذیبی ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ مہذب انسان کے قائل نہیں۔ دراصل وہ انسان کو 'مہذب' سے زیادہ 'بے ضرر' دیکھنا چاہتے ہیں اور انسانی زندگی کو غیر فطری طور پر پاکیزہ دیکھنے سے زیادہ فطری طور پر آرام دہ اور خوشگوار دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ممکن ہے ان کا یہ اندازِ فکر بہتوں کے لیے اطمینان بخش نہ ہو۔ لیکن اس میں کیا شک کہ اگر انسان اس معیار تک بھی پہنچ جائے تو یہ دنیا جنت بن جائے۔

جوش کے شوخ طبع، بذلہ سنج اور طباع ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ گفتگو میں ان کی یہ تمام خصوصیتیں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ انھوں نے بہت سی باتوں کے لیے اپنی زبان یا اپنی اصطلاحات ایجاد کر رکھی ہیں۔ اگر ان سے تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی جائے تو کہتے ہیں اچھا آپ کو کرنٹ اکاؤنٹ سے سناتا ہوں۔ بادہ نوشی کے دوران اگر انھیں پیشاب کی حاجت محسوس ہو تو کہیں گے میں ذرا MINUS ہو آؤں۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے جو بادہ نوشی میں شریک نہ تھے ان کی تقلید میں کہا۔ میں بھی ذرا MINUS ہو آؤں۔ اس پر جوش نے کہا کہ آپ PLUS تو ہوئے ہی نہیں، پھر MINUS کیونکر ہوں گے۔ ان کے بعض فقرے جو ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا بہترین ثبوت ہیں کلاسک لطیفے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک مشہور پروگرام میں جب اُن سے رقص پر اظہارِ خیال کے لیے کہا گیا تو انھوں نے کہا رقص جسم کی شاعری ہے اور شاعری رُوح کا رقص ہے۔ اپنے دوست مولانا مودودی کے گردے

ہیں پتھری کی شکایت سن کر اُنھوں نے جو لاجواب فقرہ کہا تھا کہ مولانا! اب آپ اندر سے سنگسار کیسے جارہے ہیں' وہ غالباً ہر شخص کے علم میں ہے۔ اسی انداز کا ایک اور فقرہ بھی اُنھوں نے مولانا مودودی ہی سے کہا تھا۔ جب اُنھوں نے 'جبر و قدر' کے موضوع پر مولانا مودودی کی کتاب پڑھی تو متعدد مقامات پر وہ مولانا سے متفق نہ ہو سکے۔ ان مقامات پر نشان لگا کر مولانا کے پاس لے گئے کہ شاید گفتگو میں وہ مطمئن کر دیں۔ لیکن جب اُنھوں نے مولانا کو تاویل بیجا کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا تو یہ کہہ کر چلے آئے کہ مولانا! 'ایمان کی خاطر بے ایمانی نہ کرو'۔

۱۹۷۵ء

اے کے بروہی

بروہی صاحب پاکستان کی ان چند شخصیتوں میں سے ہیں جنھیں بین الاقوامی اہمیت اور مقبولیت حاصل رہی ہے۔ بنیادی طور پر وہ قانون کے بین الاقوامی ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن ہیگ اکیڈمی آف انٹرنیشنل لا اور یو ان او جیسے بین الاقوامی ادارے انھیں عالمی سیاست پر بھی اظہارِ خیال کی دعوت دے چکے ہیں اور یورپ اور امریکہ کی ممتاز یونیورسٹیاں تاریخ اور فلسفے پر بھی ان کے لیکچر سے مستفید ہوتی رہی ہیں۔ قانون، سیاست، تاریخ، فلسفہ، مذہب اور ادب و ثقافت جیسے موضوعات کا اتنا بڑا عالم جو بین الاقوامی سطح پر مؤثر طریقے سے ہماری نمائندگی کر سکے غالباً بروہی صاحب کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ ان کی دانش ورانہ فضیلت کا اعتراف پاکستان سے زیادہ باہر کی دُنیا میں کیا گیا ہے اور ان کے علم و بصیرت سے زیادہ استفادہ بھی باہر کی دُنیا کرتی رہی ہے۔ پاکستان کے تعلیمی، ادبی اور ثقافتی اداروں کو اتنی توفیق بھی میسر نہیں کہ ان سے زیادہ سے زیادہ مفت لکچر بھی سُن سکیں۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں اور بصیرتوں کے اعتراف کے باوجود انھیں مدعو کرنے میں کئی نزاکتیں اور مصلحتیں مانع آجاتی ہیں۔

میں نے بروہی صاحب کا نام پہلے پہل اس وقت سنا جب وہ حکومت پاکستان کی مرکزی کابینہ میں وزیرِ قانون کی حیثیت سے شامل کیے گئے گو اس سے

پہلے وہ کئی معرکے سر کر چکے تھے۔ ان سے میری ابتدائی واقفیت قدرے تعصب کے ساتھ شروع ہوئی۔ قلمدان وزارت سنبھالنے کے بعد جب وہ ڈھاکے میں فلوسوفیکل کانگریس پاکستان کے پہلے صدر منتخب ہوئے تو مجھے خیال آیا کہ پاکستان نے اپنی روایت کے مطابق مسند علم و حکمت پر بھی ایک امیر و زبر قسم کے آدمی کو بٹھا دیا۔ لیکن جونہی فلوسوفیکل کانگریس کے عام اجلاس کے بعد ان کے خطبۂ صدارت کی شہرت میرے کان تک پہنچی میں ان کی طرف کھنچنے لگا اور صرف میں کیا دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈھاکے کے یونیورسٹی طلبہ اور ذہنی حلقے کے ہیرو بن گئے۔ غالباً پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں میں ڈھاکا یونیورسٹی کے طلبہ ان کے سب سے بڑے شیدائی تھے۔ جب وہ وزارت کے عہدے سے الگ ہو گئے جب بھی ڈھاکا یونیورسٹی کے طلبہ اور بنگالی اکیڈمی جیسے ادارے ڈھاکے میں بروہی صاحب کے پیشہ ورانہ دورے سے فائدہ اٹھا کر ہر مرتبہ دو ایک تقریروں کا انتظام ضرور کرتے۔ میں جس قدر ان کی تقریریں سنتا گیا اتنا ہی ان سے مسحور ہوتا چلا گیا۔

مجھے یہ دریافت کرنے میں دیر نہ لگی کہ بروہی صاحب کی وزیرانہ اور سفیرانہ حیثیتیں ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو ہرگز نہیں یعنی ان کی اصل اہمیت یہ نہیں ہے کہ وہ پاکستان کے سابق وزیر اور سفیر رہ چکے ہیں یا یہ کہ وہ پاکستان کے سب سے زیادہ روپے کمانے والے وکیلوں میں سے ہیں۔ یہ امتیازات ان سے بدرجہا کمتر درجے کے لوگوں کو حاصل رہے ہیں۔ مجموعی طور پر پاکستان میں ان سے زیادہ جامع العلوم، وسیع المطالعہ اور تحریر و تقریر دونوں کا دھنی غالباً کوئی اور نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان اپنے اس لعل گراں بہا سے اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکا ہے جتنا کہ اٹھانا چاہیئے تھا۔

جب بروہی صاحب، ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر کے عہدے سے فارغ ہو کر پاکستان واپس آئے تو اس وقت تک، میں اُن کی کئی تقریریں سن

چکا تھا اور ان کی کتاب AN ADVENTURE IN SELF-EXPRESSION پڑھ چکا تھا۔ یہ محسوس کرنے کے باوجود کہ میرے ان کے انداز فکر میں زمین آسمان کا فرق ہے میں نے انھیں ایک طویل خط لکھنے کی جسارت کی جس میں میں نے اُن سے کئی فلسفیانہ اور مذہبی سوالات کیے جو میرے لیے روحانی مسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سوالات مدلل انداز میں تھے مقصد یہ تھا کہ یا تو بروہی صاحب کے جواب سے مجھے اپنے مسائل کے حل مل جائیں گے یا بروہی صاحب مجھ پر کم از کم میرے سوالات کے نقائص یا منطقی مغالطے واضح کردیں گے۔ بروہی صاحب نے جواب میں چار صفحے کا خط بھیجا۔ لیکن انھوں نے میرے سوالوں کا جواب دینے کی بجائے یہ امید ظاہر کی کہ جس نے میرے دل میں شکوک پیدا کیے ہیں وہی ان کو دور بھی کرے گا۔ ان کا پورا خط نہایت شفقت آمیز تھا اور پہلا جملہ نہایت حوصلہ افزا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ 'آپ کا خط میرے لیے باعث عزت ہے اور میں اس میں ایک عظیم روح کا کرب دیکھتا ہوں'۔ میری روح عظیم تو خیر کیا ہوگی لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ کائنات، خالق کائنات اور انسانی زندگی سے متعلق کئی طرح کے کرب میں مبتلا رہی ہے۔

بروہی صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ مارچ ۱۹۶۲ء میں شروع ہوا اور ۱۹۶۹ء تک چلتا رہا۔ پہلے خط کے بعد جب وہ ڈھاکے آئے تو آنے سے پہلے انھوں نے ایک خط میں مجھ سے خواہش کی کہ میں ان سے ملوں۔ بنگالی اکیڈمی کی ایک نشست میں جو ان کے اعزاز میں ترتیب دی گئی تھی میں ان سے ملا۔ بڑی شفقت سے انھوں نے مجھ سے معانقہ کیا۔ اس کے بعد جب بھی وہ ڈھاکے آتے ان سے میری کم از کم ایک ملاقات ضرور ہو جاتی۔ کبھی اُس شاہ باغ ہوٹل یا ہوٹل انٹرکونٹی نینٹل میں جہاں ان کا قیام ہوتا اور کبھی کسی ثقافتی تقریب میں جہاں ان کی تقریر ہوتی۔ اُن کی تقریر پر میں خط میں اظہار خیال کرتا — وہ میری تنقید کا نہ صرف خیر مقدم کرتے بلکہ اس کے لیے اظہار تشکر بھی۔

بروہی صاحب جیسی شخصیت سے میں نے اپنی ملاقاتوں کو اپنے لیے ہمیشہ ایک زبردست آزمائش محسوس کیا خصوصاً اس لیے بھی کہ ان کی لسانی طراری (GIFT OF THE JAB) GAB میرے اندر تاب گویائی باقی نہیں رہنے دیتی۔ میری ان کی ملاقات اجتماع ضدین کی حیثیت رکھتی آئی ہے۔ ان کا علم جتنا وسیع اور حاضر ہے اور انگریزی میں ان کی گفتگو جتنی رواں اور دلکش اتنا ہی میرا علم محدود اور وہ بھی غیر حاضر۔ اور جہاں تک گفتگو کا تعلق ہے انگریزی تو انگریزی مجھے تو اردو بھی روانی کے ساتھ بولنا نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں بروہی صاحب سے ملاقاتوں سے زیادہ نصف ملاقاتوں یعنی خط و کتابت میں اپنی پوزیشن کو نسبتاً بہتر محسوس کرتا رہا ہوں۔ لیکن بروہی صاحب نے میری ہیچ مائگی کے باوجود مجھ سے ملنے سے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ ایک مرتبہ ان کے پاس مجھ سے ملنے کے لیے صبح کے سوا کوئی اور وقت نہ تھا۔ میری دشواری یہ تھی کہ مجھے صبح کے آٹھ بجے کالج میں پہلا پیریڈ لینا پڑتا تھا۔ انھوں نے مسئلے کا حل یہ نکالا کہ میں سات بجے ہوٹل پہنچ کر انھیں کے ساتھ ناشتہ کروں، باتیں کروں اور پیریڈ شروع ہونے سے دس منٹ پہلے ان کی مہیا کردہ کار پر کالج پہنچ جاؤں۔ دو ایک مرتبہ دوپہر کے کھانے پر ملاقات کے سوا کوئی وقت نہ تھا۔ بعض اوقات صرف اتنا ہی ممکن تھا کہ کسی تقریب میں خود بروہی صاحب کے مہمان کے طور پر شریک ہو کر ان سے پانچ دس منٹ کی ملاقات کر لوں۔ کراچی میں اُن کی منصبی مصروفیات کو دیکھ کر میں حیران رہا کہ اس درجہ مصروف آدمی میرے خطوں کا جواب خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر کیونکر بھیجتا رہا۔ میرے نام اُن کے خطوط طویل بھی ہیں اور مختصر بھی۔ لیکن زیادہ تر ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ بہت کم ٹائپ کیے ہوئے اور جو ٹائپ کیے ہوئے ہیں ان میں عدیم الفرصتی کی معذرت ضرور ہے۔

بروہی صاحب کی تقریر میرے لیے فردوس گوش کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے ظفر اللہ خاں، پطرس بخاری، شہید سہروردی اور ممتاز دولتانہ جیسے

پاکستانی مشاہیر اور عظیم مقررین کی تقریریں نہیں سنی ہیں لیکن ان مشاہیر سے کمتر درجے کے جن مقرروں کو سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ بردہی صاحب کے مقابلے میں مجھے بالکل نہیں جچتے۔ بردہی صاحب کو میں نے درجۂ اول کا مقرر ہی نہیں نہایت عمدہ ٹیبل ٹاکر بھی پایا ہے۔ ان کی گفتگو اور تقریر کے جملوں کی خوبصورتی اور دل آویزی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ان کی تقریروں میں ان کی تحریروں کی طرح لمبے جملے خاصی تعداد میں ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے لمبے جملوں کو ادا کرتے وقت کبھی ان کی ساخت کو بدلتے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔ ان کا ہر طویل جملہ اپنی ابتدا، ارتقا اور انتہا کی منزلوں کو بڑی سہولت کے ساتھ طے کرتا نظر آتا ہے۔ گفتگو ہو یا تقریر کسی لفظ کی تلاش میں انھیں سوچتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ان کی تقریروں کے موضوعات سنجیدہ ہی نہیں بلکہ عام آدمیوں کے لیے بسا اوقات خشک بھی ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے حسنِ بیان اور برمحل لطیفوں سے ہر تقریر کو نہایت دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ جہاں ان کی تقریروں سے ان کا حیرت انگیز علم ظاہر ہوتا ہے وہاں سوال وجواب کے دوران ان کے بعض جوابوں سے ان کا پندارِ علم بھی جھلکتا ہے جو کم از کم اس لحاظ سے مجھ پر گراں نہیں گزرتا کہ جب اس دنیا میں معمولی سے معمولی امتیاز رکھنے والے پندار کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہتے تو پھر بردہی صاحب جیسے غیر معمولی وسیع علم کے مالک پندارِ علم سے کیونکر محفوظ رہ سکتے ہیں۔ بظاہر ان میں انکسار بہت ہے لیکن سوال وجواب کے دوران ان کا ایک ایک لفظ یا ایک ایک فقرہ ان کے اندرونی احساسِ برتری کی غمازی کر رہا ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ سوال کی داد یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ یہ بہت عمدہ سوال ہے یا یہ کہ اس سوال کی بنا پر میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔ اگر سوال کرنے والا حجت شروع کر بیٹھے تو وہ یہ کہہ کر اسے فوراً بٹھا دیتے ہیں کہ اس معاملے میں مجھ سے حجت نہ کرو۔ اس پوائنٹ پر میں تمھیں ایک سال تک کھڑا رکھ سکتا ہوں۔ ان کی تقریروں پر دو چار مرتبہ میں نے بھی سوالات کیے ہیں۔ دو تین مرتبہ مجھے ان سے اپنے سوالوں کی داد بھی ملی ہے اور دو ایک مرتبہ ایسا بھی محسوس ہوا ہے کہ ان کے جواب میں جھنجھلاہٹ کا

عنصر تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ ڈھاکے کے ہوٹل انٹرکونٹی ننٹل میں ایک طویل فلسفیانہ تقریر کر چکے تو میں نے ان کی کسی بات کا حوالہ دیتے ہوئے کائنات اور انسانی زندگی کا آخری (ULTIMATE) مقصد دریافت کیا۔ جواب میں انھوں نے کہا کہ انسان کا کائنات اور زندگی کا آخری مقصد پوچھنا ایسا ہی ہے جیسے ایک ایک کتا اپنے مالک سے پوچھے کہ اس (کتے) کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ بروہی صاحب کے اس جواب پر میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا خدا اور انسان کے درمیان وہی رشتہ ہے جو کتے اور اس کے مالک کے درمیان ہوتا ہے؟ اگر انسان فی الواقع خدا کا نائب ہے تو اسے یہ پوچھنے کا حق ضرور ہے کہ یہ کائنات اور انسان کی زندگی کس مقصد سے پیدا کی گئی ہے۔ ایک مرتبہ جب میں نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن (سابق ڈائرکٹر ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ اسلام آباد) سے یہ سوال کیا اور پوچھا کہ قرآن نے اس باب میں کوئی واضح بات کہی ہے یا نہیں تو انھوں نے کہا کہ اس بارے میں قرآن کچھ نہیں کہتا۔ دراصل کائنات اور زندگی کا مقصد رفتہ رفتہ اپنے آپ کو UNFOLD کر رہا ہے۔ میں اس جواب سے بھی مطمئن نہ ہو سکا تھا۔

بروہی صاحب کی تقریر سے میری دل چسپی نے مجھے اس بات پر بھی مجبور کیا کہ میں انھیں ہائی کورٹ میں کسی مقدمے کی پیروی کرتے ہوئے سنوں۔ چنانچہ میں نے انھیں ڈھاکا ہائی کورٹ میں دو مقدموں کی پیروی کرتے ہوئے بھی سنا۔ وہاں بھی ان کا انداز ویسا ہی پُرسکون، پُراعتماد اور باوقار تھا جیسا کہ ان کی تمام تقریروں میں ہوتا ہے لیکن چونکہ ان کی وکیلانہ تقریریں قانونی اصطلاحوں اور حوالوں سے آراستہ ہوتی ہیں اس لیے ان میں عام آدمی کے لیے وہ دل کشی نہیں ہوتی جو ان کی دوسری تقریروں میں پائی جاتی ہے۔

ڈھاکا ہائی کورٹ کے جن دو مقدموں میں مجھے بروہی صاحب کو سننے کا اتفاق ہوا ان میں سے ایک مقدمے میں ان کے حریف شہید سہروردی تھے جو اس مقدمے میں کامیاب رہے۔ کہا جاتا ہے کہ سہروردی ایک بڑے قانونی دماغ

ہونے کے علاوہ انگریزی کے زبردست مقرر بلکہ خطیب (ORATOR) بھی تھے۔ بروہی صاحب کی تقریروں میں خطیبانہ شان نہیں پائی جاتی البتہ ان کی ہر تقریر میں ایک فلسفیانہ فضا ضرور ملتی ہے۔

شہید سہروردی کے ساتھ بروہی صاحب کا تعلق صرف ایک ہم پیشہ اور حریف کا تعلق نہ تھا۔ سہروردی اُن چند شخصیتوں میں سے تھے جو بروہی صاحب کی نظر میں حد درجہ محترم رہی ہیں۔ سہروردی کی وفات کے بعد بروہی صاحب نے سہروردی پر جو مضمون لکھا تھا اس کے عنوان (سہروردی کو خراج تحسین) ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں بروہی صاحب کی رائے کتنی بلند ہے۔ وہ انھیں درجۂ اول کا سیاست داں اور قومی ہیرو مانتے ہیں۔ اُسی مضمون میں انھوں نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ انھیں پاکستان کے جن وکلا کے خلاف مقدمے لڑنے کا اتفاق ہوا ہے ان میں سہروردی اپنا درجہ آپ تھے۔ قانون پر غیر معمولی عبور ہونے کے علاوہ انھیں اپنے نکات کو اس قدر دلکش انداز میں پیش کرنے پر قدرت تھی جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ سہروردی کی خطیبانہ دل آویزیوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بروہی صاحب جن کے معیار نظر کی بلندی کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ وہ اپنی خطابت سے ایسی فضا پیدا کر دیتے تھے کہ عدالتِ عالیہ کی دیواریں بھی ان کے موکل کے مقدمے کی صداقت کی گواہی دیتی محسوس ہوتی تھیں۔

اپنے بڑوں کو نہ جاننا یقیناً ایک بدنصیبی ہے لیکن جاننے والوں کا جانتے ہوئے بھی ان کے بارے میں خاموش رہنا یا اُن پر لکھنے لکھانے میں بیجا تاخیر کو راہ دینا قومی جرم سے کچھ کم نہیں اور اس باب میں بروہی صاحب کا دامن بھی داغ دار ہے۔ علامہ آئی آئی قاضی جو بروہی صاحب کے معنوی اور روحانی باپ تھے اور جن کے بارے میں بروہی صاحب نے ایک مرتبہ مجھے خط میں لکھا کہ دُنیا کا عظیم ترین شخص جس سے میں ملا ہوں آئی آئی قاضی تھے اور جن کے بارے میں انھوں

نے مجھ سے زبانی گفتگو میں ایک سے زائد مرتبہ کہا کہ امام غزالی کے بعد علامہ قاضی مسلمانوں میں دوسری بڑی شخصیت تھے اُن پر آج تک خود بروہی صاحب نے قلم نہیں اُٹھایا۔ قاضی مرحوم پر ایک مکمل کتاب لکھنے کا ارادہ وہ ضرور رکھتے ہیں لیکن دُنیا کو ایسے ارادے سے کیا فائدہ پہنچے گا جو عمل میں نہ آسکے۔ پھر یہ کہ علامہ قاضی مرحوم کی ذات میں جو عظمت بروہی صاحب کو نظر آتی ہے اس کا علم تو دنیا کو بروہی صاحب ہی کے ذریعے سے ہوسکتا ہے۔ علامہ مرحوم کی موت جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے خودکشی کے ذریعے سے ہوئی تھی۔ جب میں نے بروہی صاحب سے اپنی اس اُلجھن کا اظہار کیا کہ اسلام کا اتنا بڑا عالم اور مبلغ خودکشی پر کیونکر آمادہ یا مجبور ہو گیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ دراصل اُن کی خودکشی بھی ایک مسئلہ ہے جس سے میں اپنی کتاب میں پردہ اٹھاؤں گا۔ لیکن چونکہ بروہی صاحب نے اب تک وہ کتاب نہیں لکھی اس لیے علامہ قاضی کی خودکشی بھی ایک سربستہ راز کی حیثیت رکھتی ہے۔

بروہی صاحب مزاجاً حد درجہ مذہبی واقع ہوئے ہیں۔ برسوں پہلے انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ میں ہوا کے بغیر کچھ دیر زندہ رہ سکتا ہوں لیکن خدا کے تصور کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسلام اور اسلامیات سے اُن کا شغف روز افزوں ہے۔ فلسفے میں ایم اے کرنے کے زمانے میں انھوں نے مغربی فلسفے کو چبانے اور ہضم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ادھر کئی سال سے وہ اسلامی فلسفے کے مطالعے میں منہمک ہیں۔ آنحضرت کی ایک سیرت لکھنے کا خیال بھی کئی سال سے ان کے ذہن میں پرورش پا رہا ہے۔ منصبی مصروفیات کی کثرت اس خیال کو عمل میں نہیں آنے دیتی۔ اب ان کی تحریروں اور تقریروں میں تفکر سے زیادہ تبلیغ کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اب وہ اپنی تقریروں کو بسا اوقات علمائے دین کی طرح کسی آیت کی تلاوت سے شروع کرتے ہیں۔ روحانی طور پر وہ FRITHG OF SEHUAN کے مریدوں میں سے ہیں۔ یہ جو ایک

صوفی منش مسلمان عالم اور مصنف ہیں پیرس میں رہتے ہیں۔ اسلام پر انگریزی میں ان کی کتابیں (۱) UNDERSTANDING ISLAM
اور (۲) DIMENSIONS OF ISLAM پاکستان میں دستیاب رہی ہیں۔ ایران کے شہرہ آفاق عالم اور مصنف سید حسین نصر بھی، جو بروہی صاحب کے ذاتی دوست ہیں SCHUON کے مریدوں میں تھے، ہیں۔
اپنی گہری مذہبیت کے باعث مطالعے کے معاملے میں بروہی صاحب اُن مصنفوں سے زیادہ شیفتگی رکھتے ہیں جن کے ہاں مذہبیت اور روحانیت سے لگاؤ پایا جاتا ہے۔ مثلاً انھیں مشہور مورخ ٹوائن بی اور مشہور شاعر ٹیگور کی تصانیف سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ ٹوائن بی کے نظریۂ تاریخ پر انھوں نے اپنی پہلی کتاب AN ADVENTURE میں ایک طویل مضمون بھی لکھا ہے جس میں اس نظریے پر تنقید کی گئی ہے۔ ٹوائن بی کی کتاب 'مطالعۂ تاریخ'، (جو دس جلدوں میں ہے) ان کا سب سے بڑا کارنامہ مانی جاتی ہے۔ لیکن بروہی صاحب کے نزدیک ٹوائن بی کی عظیم تر تصنیف AN HISTORIAN'S APPROACH TO RELIGION ہے۔

ٹوائن بی سے بروہی صاحب کی ملاقاتیں اور مراسم بھی رہے۔ ایک مرتبہ غالباً اٹلی کے کسی ہوٹل میں دونوں دو ہفتے قیام پذیر رہے۔ اس دوران میں ٹوائن بی سے بروہی صاحب کی طویل ملاقاتیں رہیں۔ کراچی میں بروہی صاحب ہی کی صدارت میں ٹوائن بی کی تقریر ہوئی تھی۔ اسی طرح اٹلی کے مشہور فلسفی میڈری یاگا جو ایک نامور سفیر بھی رہے ہیں جب کراچی آئے تھے تو ان کے اعزاز میں ہونے والی تقریب کی صدارت بھی بروہی صاحب ہی نے کی تھی۔

بروہی صاحب مشہور برطانوی مصنف ROBERT BRIFFALT کے بڑے عقیدت مند رہے ہیں۔ اس کی کتاب PSYCHE'S LAMP کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اگر دُنیا سے نفسیات کی ساری کتابیں ناپید ہو جائیں اور صرف یہ ایک کتاب رہ جائے تو اس سے باقی کتابوں کی تلافی ہو

جائے گی۔ کئی سال پہلے بروہی صاحب برٹ نولٹ سے ملنے کی آرزو لے کر جب لندن گئے تو وہاں جاکر انھیں معلوم ہوا کہ صرف دو ایک ماہ قبل برٹ نولٹ کا انتقال ہو چکا ہے۔

ایک زمانے میں بروہی صاحب مغربی فکشن بہت پڑھتے تھے۔ ٹالسٹائی، دوستوفسکی اور ٹومس مان ان کے محبوب ناول نگاروں میں سے ہیں۔ اب فکشن پڑھنے کے لیے انھیں زیادہ مہلت نہیں ملتی۔ لیکن فکشن کے مطالعے کی افادیت سے انھیں اب بھی انکار نہیں ہے۔ مغربی شاعروں میں انھیں گوئٹے سے خصوصی دل چسپی رہی ہے۔ اس کی کتاب فاؤسٹ سے وہ بے حد متاثر رہے ہیں۔ فلسفیوں میں کانٹ ان کا محبوب ترین فلسفی ہے۔ جدید المانی فلسفیوں میں ہرمن کیسر لنگ سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ مغرب کے جدید ترین فلسفے وجودیت سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ اس پر معترض رہے ہیں اور اپنے اعتراضات کو برسوں پہلے مضمون کی شکل دے چکے ہیں۔ ایک زمانے تک وہ روسی مفکر P.D.OUSPANSKY اور اطالوی مفکر پیناموفو سے مسحور رہے ہیں۔ بروہی صاحب کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد حاضر کے ادیبوں میں انھیں آلڈس ہکسلی سے خصوصی دل چسپی رہی ہے۔ امریکی ادبا و شعرا میں وہ ایمرسن کے بہت قائل ہیں۔ فلسفیوں میں ولیم جیمز سے خاص لگاؤ ہے اور سیاسی مصنفوں میں والٹر لیپ مین کی ژرف نگاہی کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ جہاں تک ان کے مطالعے کا تعلق ہے نہ جانے انھوں نے کتنے ادیبوں اور مفکروں کو پڑھا ہے۔ جدید سے جدید لکھنے والوں کی اہم کتابوں سے غافل نہیں رہتے۔ ہر سال انھیں کم از کم دو تین مرتبہ یورپ جانے کا اتفاق ضرور ہوتا ہے۔ اپنے بیرونی سفر میں وہ وقت کی اہم ترین کتابوں سے رابطہ قائم کر لیتے ہیں۔

میں کبھی کبھار اپنے پسندیدہ لکھنے والوں کے بارے میں ان کی رائے پوچھتا رہا ہوں۔ میرے دو محبوب ترین اہل قلم کے بارے میں انھوں نے کبھی اچھی

رائے ظاہر نہیں کی گو ان کی غیر موافقانہ رایوں کے باوجود ان دونوں سے میری دل چسپی میں رتی برابر کمی نہیں آئی۔ ان دو میں سے ایک تو ہیں برٹرنڈ رسل اور دوسرے ڈاکٹر رادھا کرشنن۔ برٹرنڈ رسل کے بارے میں ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ رسل پر اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ رادھا کرشنن پر ان کا اعتراض یہ رہا ہے کہ وہ کوئی گہرے مفکر نہیں ہیں۔ انھوں نے ہندو فلسفے کو مقبول عوام بنانے کے لیے کتابیں لکھی ہیں اور بس۔ ایک مرتبہ جب میں نے وِل ڈیوراں اور کلفٹن فیڈی مَین کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ میری رائے آپ کے لیے غیر متعلق ہوگی کیونکہ ایک ترقی کرتا ہوا دماغ اپنی تفہیم کی سطح کے مطابق کسی کتاب کو ہضم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے نکتے کی بات یہ لکھی کہ دو ہزار کتابوں کو بے دلی سے پڑھنے کی بہ نسبت آدھے درجن کتابوں کو بیس مرتبہ پڑھنا بہتر ہے۔

مختلف عوامل کے زیر اثر بروہی صاحب کا مزاج مذہبی اور متصوفانہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً دس سال پہلے جب ان کے ایک دوست نے جو مولانا روم کی زندگی اور شاعری سے گہری دل چسپی رکھتے ہیں یہ تجویز پیش کی کہ پاکستان میں رومی سوسائٹی بننی چاہیئے تو بروہی صاحب نے اس تجویز کی حمایت کی اور اس سوسائٹی کی تشکیل کے لیے پاکستان کے تمام علاقوں سے ۳۴ آدمیوں کا انتخاب کیا جن میں ایک نام میرا بھی تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھے ایک طویل خط لکھا جس میں مجوزہ سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی لیکن نہ جانے حالات نے کیا پلٹا کھایا کہ اس سوسائٹی کا قیام عمل میں نہ آسکا۔

مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات کی روز افزوں خرابی کے پیش نظر دسمبر ۱۹۶۹ء میں میں مشرقی پاکستان کو خیرباد کہہ کر مستقل طور پر کراچی آگیا۔ اس سے پہلے بھی میں نے مغربی پاکستان منتقل ہونے کی کوشش کی لیکن اس باب میں بروہی صاحب کی سفارشوں کے باوجود ناکام رہا۔ ایک مرتبہ انھوں نے میرا تقرر سندھ یونیورسٹی میں کرانے کی کوشش کی۔ سندھ یونیورسٹی نے ان کی سفارش کے زیر اثر مجھے ریسرچ اسکولر

کی حیثیت سے ایک نوکری تو ضرور عنایت کی لیکن اس میں تنخواہ اتنی کم تھی کہ میرے لیے اسے قبول کرنا ممکن نہ ہوا۔ دوسری مرتبہ انھوں نے مجھے پشاور یونیورسٹی میں جگہ دینے کے لیے اس زمانے کے وائس چانسلر محمد علی سے وعدہ لے لیا۔ لیکن پاکستان میں وعدے وعید سے زیادہ اہمیت کرسئ اقتدار کی ہے۔ اس لیے محمد علی صاحب نے بروہی صاحب جیسے معزز آدمی سے بھی کیے ہوئے وعدے کے ایفا کو ضروری نہیں جانا۔ بہرحال میں دسمبر ۱۹۶۹ء میں جمیل الدین عالی کی عنایتوں کی بدولت کراچی آگیا۔ امید یہ تھی کہ کراچی میں رہنے کے باعث بروہی صاحب سے استفادے کے مواقع زیادہ ملتے رہیں گے لیکن ہوا یہ کہ میرے ان کے درمیان جو فاصلے تھے ان میں کوئی کمی نہ آئی ــــــ بلکہ بعض اوقات یہ محسوس ہوا کہ کراچی سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر ڈھاکے میں رہنے کے باوجود میں بروہی صاحب سے قدرے نزدیک تر تھا۔ بہرحال کراچی کے دورانِ قیام میں مہینے دو مہینے پر بروہی صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا جو ان کی منصبی مصروفیتوں کے باعث مختصر ہی ہوا کرتی تھیں۔ کراچی میں بروہی صاحب سے پہلی ملاقات ان کے گھر پر ہوئی۔ انھوں نے بیگم بروہی اور اپنی بچیوں (بروہی صاحب کی اولاد میں کل تین لڑکیاں ہیں) سے میرا تعارف کرایا اور کھانا کھانے پر اصرار کیا۔

کراچی کے دورانِ قیام میں ایک مرتبہ میں بروہی صاحب سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ پنڈی گئے ہوئے ہیں۔ یاد نہیں آتا کہ اس موقع پر مجھے بروہی صاحب کو کون سی اطلاع دینا تھی۔ نتیجتاً میں نے بیگم بروہی سے ملنا ضروری سمجھا۔ ملازم نے مجھے گھر کے اندرونی حصے میں بٹھا دیا۔ بیگم بروہی اور ان کی بچیاں بڑے اخلاق سے پیش آئیں۔ اس زمانے میں ان کی سب سے چھوٹی لڑکی طاہرہ کراچی یونیورسٹی میں فلسفے میں ایم اے کر رہی تھی۔ کچھ دیر صرف بڑی لڑکی حفیظہ سے باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے پوچھا آپ کو فلسفے سے کچھ دلچسپی ہے یا نہیں۔ نفی میں جواب دیتے ہوئے اس نے کہا۔ فلسفہ اباجان جیسے لوگوں کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن باقی لوگوں

کے لیے بیکار ہے۔ میں اس جواب سے محفوظ ہوا اور بعد میں میں نے از راہِ تفنن بروہی صاحب سے اس گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آپ فلسفی ہیں۔ لیکن خود آپ کے گھر میں فلسفے کی مخالفت موجود ہے۔ آپ کی بیٹی حفیظہ فلسفے کو لاحاصل سمجھتی ہیں۔ اس پر بروہی صاحب نے ایک خوبصورت جملہ کہا جو آج تک مجھے یاد ہے۔ جملہ یہ ہے PHILOSOPHY CAN BE COUNTERACTED ONLY BY ANOTHER PHILOSOPHY.

۱۹۶۴ء میں جب بروہی صاحب نے اپنی بیٹی حفیظہ کی شادی کی تو اس تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ میرے نام ڈھاکے بھیجا۔ اس وقت تک مجھے ڈھاکے یا مشرقی پاکستان میں رہتے ہوئے سولہ سال ہو چکے تھے لیکن اس دوران میں خواہش اور کوشش کے باوجود کبھی مغربی پاکستان جانا میرے لیے ممکن نہ ہو سکا تھا۔ ایسی صورت میں بروہی صاحب جیسے بڑے آدمی کے ہاں شادی کی تقریب میں کیونکر شریک ہوتا۔ بہرحال میں نے تقریب میں شرکت سے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے اس مبارک اور عظیم فرض کی ادائیگی اور اس سے سبکدوشی پر بروہی صاحب کو مبارکباد اور حفیظہ کو دعائیں لکھ بھیجیں۔ جب وہ اس تقریب سے فارغ ہوئے تو انھوں نے مجھے ایک خط بھیجا جو مختصر ہونے کے باوجود ایک ایسے باپ کے جذبات کا مرقع ہے جسے بیٹی کی شادی سرانجام دینے کا پہلا تجربہ حاصل ہوا۔ اس جذباتی تقریب نے قانون اور فلسفے میں رچے بسے بروہی صاحب کو جذباتی اعتبار سے کتنا زبر و زبر کیا اور اس موقع پر عزیزوں، دوستوں، مخلصوں اور بہی خواہوں کے نیک جذبات نے کس حد تک انھیں جذباتی استحکام بہم پہنچایا اس کے اعتراف میں بروہی صاحب نے بخل سے کام نہیں لیا گو وہ ایسا بھی کر سکتے تھے۔

ڈھاکے کے دورانِ قیام میں جب یہ خبر میری نظر سے گزرتی کہ کراچی کے فلاں کالج یا فلاں ادارے میں بروہی صاحب نے تقریر کی تو مجھے اس تقریر سے محروم رہ جانے کا شدید احساس ہوتا اور یہ خیال آتا کہ اگر میں بھی کراچی میں ہوتا تو بروہی

صاحب کی تقریر جیسی ذہنی نعمت سے محروم نہ رہتا۔ لیکن کراچی کے ڈیڑھ سالہ قیام میں مجھے اس محرومی کے دُگنے احساس سے دوچار ہونا پڑا کیونکہ کراچی میں رہتے ہوئے ان کی تقریروں سے محروم رہ جانا میرے لیے دہری محرومی تھی۔ لیکن یہ محرومی ناگزیر تھی کیونکہ بروہی صاحب جہاں جہاں تقریر کے لیے مدعو ہوتے وہاں وہاں تقریر سننے کے لیے میرا مدعو ہونا کیونکر ممکن تھا؟ تاہم میں بروہی صاحب سے یہ شکایت کیے بغیر نہ رہا کہ کراچی آکر میں آپ کی تقریروں سے پہلے کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی محروم ہو گیا ہوں۔ جواب میں انھوں نے وہی بات کہی جس کا مجھے اندازہ تھا یعنی مجھے بروقت یہ اطلاع کیسے دی جائے کہ ان کی تقریر کب اور کہاں ہونے والی ہے۔ بہرحال ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جس شام میں اُن سے ملنے گیا اسی شام آٹھ یا نو بجے فرقہ اسماعیلیہ کے سب سے بڑے جماعت خانے میں سیرت طیبہ پر ان کی تقریر تھی۔ انھوں نے کہا کہ اگر میرے ساتھ چلنا ہو تو فلاں وقت تک میرے ہاں دوبارہ آجاؤ۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ جلسے کی صدارت کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے صدر ڈاکٹر منظور کے سپرد تھی۔ بروہی صاحب مہمانِ خصوصی تھے۔ شہر کے کئی اور مقررین بھی تھے جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نعت پڑھنے والوں میں ماہرالقادری بھی تھے۔ جلسے کے ختم ہونے سے پہلے زوروں کی بارش شروع ہو گئی۔ جماعت خانے کا نظام کچھ ایسا تھا کہ جلسے کے خاتمے کے بعد بروہی صاحب اور دوسرے مہمانوں کے بٹھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ چنانچہ سب لوگوں کے ساتھ بروہی صاحب بھی جماعت کے بیرونی برآمدے میں تقریباً ایک گھنٹہ کھڑے اور لوگوں کے درمیان گھرے باتیں کرتے رہے۔ ان سے سوال کرنے والوں کا ہجوم ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ جب بارش کا زور ختم ہوا تو ایک نوجوان جو بروہی صاحب کو اپنی کار میں اُن کے گھر سے لے کر آئے تھے ان کے پاس آئے اور کہا کہ اب چلنا چاہیے۔ مجھے کچھ دُور تک بروہی صاحب کے ساتھ آنا ہی تھا۔ چنانچہ میں بھی ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر منظور بھی ساتھ تھے۔ دو ایک اور نوجوان بھی ہمراہ

تھے۔ راستے میں جو گفتگو میزبان نوجوان اور بروہی صاحب کے درمیان ہوئی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آج جلسے کے بعد بروہی صاحب کا کھانا بھی انھیں کے ساتھ تھا۔ لیکن اب چونکہ رات کے بارہ بج چکے ہیں اور سارا شہر بارش کی وجہ سے جل تھل ہو رہا ہے اس لیے کسی چائینیز ہوٹل کی بجائے کھانا نوجوان میزبان کے گھر کھایا جائے گا۔ یہ نوجوان کراچی کے بڑے صنعت کار تھے۔ ان کی کوٹھی پر پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی شیش محل میں آگیا ہوں۔ دو دو ڈرائنگ روم نہایت قیمتی فرنیچر سے آراستہ آنکھوں کے لیے دعوت نظارہ بنے ہوئے تھے۔ نوجوان میزبان نے آدھ گھنٹے کے اندر ہم سب لوگوں کو کھانے کی میز پر بٹھا دیا اور اس معذرت کے ساتھ کہ جو کچھ حاضر تھا پیش کر دیا گیا خاصا لذیذ کھانا کھلایا۔

کھانے کے بعد تقریباً ایک گھنٹے تک دلچسپ گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ اس صحبت میں ایک وکالت پیشہ نوجوان بھی تھے جو میزبان نوجوان کے دوستوں میں سے تھے۔ زیادہ تر بحثیں یہی دونوں چھیڑتے رہے۔ جواب زیادہ تر بروہی صاحب دیتے رہے اور کسی حد تک ڈاکٹر منظور۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ میں نے کھانے کے بعد بروہی صاحب کو لائٹ موڈ میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا اور سنا۔ اس سے پہلے ڈھاکے کے ہوٹل انٹر کونٹی ننٹل والی تقریب میں تقریر اور کھانے کے بعد لطائف کا سلسلہ شروع ہو گیا تو خود بروہی صاحب نے متعدد لطیفے سنائے اور دوسروں کے لطائف سے پیدا ہونے والے قہقہوں میں شریک رہے۔ عام طور پر بروہی صاحب بہت ہی بزرگانہ اور سرپرستانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں اور ان کی شخصیت کے گرد گہری متانت کا ہالہ نظر آتا ہے۔ لیکن نجی اور بے تکلف صحبتوں میں ان کے باغ و بہار ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ اس رات جب صحبت ختم ہوئی تو نوجوان میزبان نے اپنی کار پر ہم سب لوگوں کو اپنے اپنے گھر پہنچوا دیا۔

مجھے ان نوجوان میزبان کا نام یاد نہیں رہا۔ ان کے بارے میں جو بات خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ وہ بروہی صاحب کے بڑے مداحوں

میں سے تھے اور بروہی صاحب بھی انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ بروہی صاحب کے اوفس روم میں جو دو چار تصویریں ہیں ان میں سے ایک تصویر میں وہ نوجوان ان سے ہم کلام نظر آتے ہیں۔ میں نے اس نوجوان سے ملاقات سے پہلے ایک مرتبہ ازراہِ تجسس بروہی صاحب سے پوچھا تھا کہ یہ کون صاحب ہیں تو انھوں نے جواب میں کچھ اس قسم کی بات کہی تھی کہ یہ فقیروں میں سے ہیں۔ یقیناً اس نوجوان میں کچھ ایسے روحانی رجحانات ہوں گے جن کی بنا پر بروہی صاحب انھیں عزیز رکھتے تھے۔ ستمبر ۱۹۷۱ء میں اسلام آباد آجانے کے بعد ایک دن میں نے اس نوجوان پر ڈان کراچی میں بروہی صاحب کا مضمون دیکھا جس سے معلوم ہوا کہ وہ صبح کے وقت گھوڑے کی سواری کرتے ہوئے گر کر ہلاک ہو گئے۔

۱۹۶۸ء میں ڈھاکے کی ایک ادبی انجمن نے میرے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ 'میرے خیال میں' شائع کیا۔ میں نے اس کتاب کو بروہی صاحب کے نام معنون کیا اور جب کتاب ان کے پاس بھیجی تو وہ میرے اس انتساب سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے لکھا کہ میری بیگم اردو سے بہت دل چسپی رکھتی ہیں۔ وہ اس کتاب کو پڑھ کر مجھے اس کے بارے میں بتائیں گی۔ ویسے میں بھی اسے یہاں وہاں سے پڑھوں گا۔ بروہی صاحب نے مجھ سے یہ فرمائش بھی کی کہ میں کتاب کی پانچ چھ جلدیں ان کے پاس بھیج دوں۔

بروہی صاحب اگرچہ انگریزی کے سوا دوسری زبانیں کم استعمال کرتے ہیں لیکن اردو پڑھنے یا بولنے سے معذور نہیں۔ ان کی اردو خاصی رواں ہے گو اس میں تذکیر و تانیث کی غلطیاں ضرور ہوتی ہیں جو ان کے لیے ناگزیر ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ اردو کی کوئی ادبی کتاب ان کے سامنے کھلی پڑی ہے۔ میں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ آج کل آپ اردو پڑھ رہے ہیں۔ کہنے لگے میں اپنی اردو کو بہتر بنانا چاہتا ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ اردو ان کی پیشہ ورانہ ضرورت بھی ہے اور علمی ضرورت بھی۔ اسلامیات سے ان کی بڑھتی ہوئی دل چسپی انھیں اردو کتابوں

کے مطالعے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ اس کے باوجود میری ان کی ساری خط و کتابت اور زیادہ تر گفتگو انگریزی ہی میں ہوتی رہی ہے اور ایسا کرنے میں مجھے اُن کی سہولت کا خیال ملحوظ رہا ہے ورنہ جب زندگی بھر اردو لکھنے کے باوجود اردو پر قدرت حاصل نہ کر سکا تو انگریزی جیسی بیرونی زبان پر کیا قدرت حاصل کر سکوں گا۔

۱۹۷۰ء کے قومی انتخابات میں سکھر کے ایک حلقے کے لوگوں نے بروہی صاحب کو انتخاب لڑنے پر مجبور کر دیا۔ انہی دنوں ایک شام میں ان سے ملنے جا نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ بھئی بڑے اچھے موقع پر آگئے۔ میں تمھارے بارے میں سوچ ہی رہا تھا۔ میں نے ضرورت کی نوعیت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اپنے حلقۂ انتخاب کے لیے جو پہلی تقریر لکھی ہے اس کا اردو میں ترجمہ کرنا ہے۔ میں نے پوچھا اس ترجمے کے لیے کتنا وقت دیں گے۔ کہنے لگے کل شام تک مجھے ترجمہ مل جانا چاہیے۔ تقریر کی طوالت اور ترجمے کی دشواری کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے مزید ۲۴ گھنٹے کی مہلت مانگی۔ وہ بمشکل اتنا وقت دینے پر راضی ہوئے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ اس کے باوجود میں نے مقررہ وقت کے اندر ترجمہ کر لیا۔ انھیں ترجمہ سنایا تو وہ مطمئن نظر آئے۔ یہ پہلا اور اب تک آخری موقع ہے کہ مجھے ان کا ایک کام کرنا پڑا۔ تقریر کا ایک حصہ ایسی قانونی اصطلاحوں سے آراستہ تھا کہ میں اس کا مطلب سمجھ نہ سکا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ مجھے آسان الفاظ میں عبارت کا مطلب سمجھا دیں تو میں ترجمہ کر دوں۔ انھوں نے اس عبارت کی تشریح کر دی اور میں نے فی الفور ترجمہ کر دیا۔ ان کی انگریزی تقریر کی طرح اس کا یہ ترجمہ بھی ہزاروں کی تعداد میں چھپا لیکن مجھے اس کی ایک کاپی بھی نہ مل سکی۔ ساری کاپیاں راتوں رات چھپیں اور صبح ہوتے ہی حلقۂ انتخاب میں بھیج دی گئیں۔ بعد میں وہی ترجمہ اخباروں میں شائع ہوا۔

بروہی صاحب بڑے جوش و جذبے کے ساتھ انتخابات میں قومی

سیاست نے جو کروٹیں لیں ان کے پیشِ نظر انھوں نے محسوس کیا کہ اچھا ہی ہوا جو وہ کامیاب نہ ہوئے ورنہ مسائل کے پہاڑ سے سر ٹکرانا پڑتا اور وہ جو چاہتے غالباً کر نہ پاتے۔

شیخ مجیب بروہی صاحب کے بڑے نیاز مندوں میں سے تھا۔ جب بھی کراچی آتا ان سے مل کر جاتا۔ بروہی صاحب سے مجیب کی نیاز مندی صدر یحییٰ کے علم میں تھی۔ چنانچہ انتخابات کے بعد جب مجیب کا رویہ سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا صدر یحییٰ کی یہ خواہش بروہی صاحب تک پہنچائی گئی کہ وہ مجیب کو ہموار کریں۔ لیکن انھوں نے اس قضیے میں پڑنا مناسب نہ سمجھا۔ جب صدر یحییٰ نے مجیب کو گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلایا تو مجیب نے اپنا وکیل بروہی صاحب ہی کو منتخب کیا۔

جہاں تک ملک کی سیاسی جماعتوں اور شخصیتوں کا تعلق ہے ابتدا میں بروہی صاحب مسلم لیگ کے رکن رہ چکے ہیں۔ لیگی رہنماؤں میں انھیں لیاقت علی خاں سے خاص تعلق خاطر رہا ہے۔ بعد میں ان کی ہمدردیاں کسی حد تک جماعت اسلامی کو حاصل رہی ہیں اور غالباً وہ مولانا مودودی کو سب سے زیادہ قابلِ احترام گردانتے ہیں جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جب صدر ایوب کی حکومت نے مولانا کو گرفتار کیا تو بروہی صاحب ان کا مقدمہ فیس لیے بغیر لڑے۔

جب سے میں اسلام آباد آیا ہوں میرے اور بروہی صاحب کے درمیان مراسلت کا وہ سلسلہ باقی نہ رہا جو میرے ڈھاکے کے دورانِ قیام میں تھا۔ جب وہ پنڈی آتے ہیں تو یہاں بھی ان سے ملاقات نہیں ہو پاتی کیونکہ مجھے خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ کب آئے اور کب گئے۔ پچھلے سال لاہور کے ایک بک اسٹال پر اتفاقی ملاقات ہو گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ حج کے لیے جا رہے ہیں۔ امسال امریکن سنٹر پنڈی کی ایک تقریب میں جب ان سے ملاقات ہوئی تو یہ

کہتے ہوئے انھوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا

WE ARE MEETING AFTER MILLIONS OF YEARS,

جواب میں میری زبان پر یہ الفاظ آئے

FOR ME IT IS MORE THAN THAT.

جب وہ تقریر سے فارغ ہو کر جانے لگے تو میں نے ان سے ملنے کے لیے وقت مانگا۔ کہنے لگے کل صبح کراچی واپس جا رہا ہوں۔ تم مجھے خط لکھنا۔ اس بات کو تقریباً پانچ مہینے ہو رہے ہیں۔ میں اب تک انھیں خط نہ لکھ سکا۔ اب انھیں خط لکھنے کی بجائے ان پر یہ مضمون لکھ رہا ہوں تاکہ اردو ادب کے قارئین بروہی صاحب کی شخصیت کی چند جھلکیاں دیکھ لیں۔

۲۳ر اکتوبر ۱۹۷۶ء

نظیر صدیقی

کی

دوسری کتابیں

۱- شہرت کی خاطر (انشائیوں کا مجموعہ) دوسرا ایڈیشن (زیر طبع)

۲- تاثرات و تعصبات تنقیدی مضامین کا مجموعہ

۳- میرے خیال میں تنقیدی مضامین کا مجموعہ

۴- حسرتِ اظہار مجموعۂ کلام

۵- نقش ہائے رنگ رنگ (جلد اول) پروفیسر رشید احمد صدیقی کے غیر مدون مضامین کا مجموعہ

۶- تفہیم و تعبیر تنقیدی مضامین کا مجموعہ (زیر طبع)



اردو اکیڈمی سندھ کراچی